نگار

قیمت ۸ر

نرخنامۂ اُجرت اشتہار

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھا صفحہ	۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۴ روپیہ

۱- اُجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔ ورچر یا وی۔ پی کے ذریعہ وصولی منظور نہیں

۲- جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اُس کی رقم پیشگی یکمشت لی جائے گی۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا۔

۳- اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

مینیجر "نگار" لکھنؤ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر ..... پانچ روپیہ

ششماہی ہندوستان کے اندر ..... تین روپیہ

سالانہ بیرون ہند ..... بارہ شلنگ

ششماہی بیرون ہند ..... ۷ شلنگ

نوٹ:- رسالہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ بعد کو آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔

"مینیجر"

تصانیف نیاز فتحپوری

مجموعۂ استفسار و جواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۲۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں۔

قیمت:- جلد اول عہ/
جلد دوم عہ/
علاوہ محصول۔

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔

جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا دین یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے
علاوہ محصول۔

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ۔ جس میں ۳۲۔ افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں زبان، قدرت بیان، علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول۔

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخی و نفسانی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے)
علاوہ محصول۔

نگار

جلد (۳۰)	فہرست مضامین اگست سنہ ۳۶ء	شمار (۲)

ملاحظات — ۲
تاریخ صحافت پر ایک سرسری نظر — عبدالرزاق (حیدرآباد) — ۹
۱۴/اگست سنہ ۱۹۴۷ء — ۲۸
ریڈیو کا ماضی، حال اور مستقبل — ۳۲
قرض — الیاس اسلام پوری — ۳۶
حیات بعد الموت — محمد نصیر الدین۔ ایم۔ بی۔ بی۔ اس (آنرز) مونگیر — ۴۵
گاندھی جی کی نئی بانی — ۵۰
مکتوبات نیاز — ۵۳
سوئٹزرلینڈ کے وفاق کی چند خصوصیات — ڈاکٹر سید جعفری۔ بار ایٹ لا — ۵۶
مسئلۂ خلافت و امامت — ہرنام — ۶۱
باب الاستفسار — ۷۰
مطبوعات موصولہ — ۷۴
منظومات — اثر۔ ماہر۔ شمیم۔ محی الدین۔ انور۔ انجم — ۷۸

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۳۰)	اگست ۱۹۳۶ء	شمار (۲)

ملاحظات

ہماری بیماری اور اس کا صحیح علاج

جس طرح انفرادی طور پر ایک انسان مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جایا کرتا ہے، بالکل اسی طرح دنیا کی قوموں پر بھی امراض کا حملہ ہوا کرتا ہے، اور جس طرح مرض کی عدم تشخیص یا غلط علاج سے ایک انسان ہلاک ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح اپنی بیماریوں کی غلط تشخیص یا معالجین کی بے احتیاطی سے قومیں بھی مردہ ہو جایا کرتی ہیں۔ فرق اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ انسان جلد ہلاک ہو جاتا ہے اور قوم کی ہلاکت کے لئے نسبتاً زیادہ زمانہ درکار ہوتا ہے۔

ہماری قوم بھی بیمار ہے اور سخت بیمار — اس کے معالج بھی نظر آتے ہیں اور کثرت سے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مرض میں برابر اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے اور کوئی صورت استردادِ صحت کی پیدا نہیں ہوتی۔ پس آیئے چند لمحے ہم آپ بھی مل کر اس مسئلہ پر غور کریں، ممکن ہے کوئی بات سمجھ میں آ جائے۔ سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اکابر قوم نے ہمارا مرض کونسا تجویز کیا ہے اور اس کے بعد یہ کہ علاج کی کیا صورتیں انھوں نے اختیار کی ہیں۔ اس سلسلہ میں نہایت عجیب و غریب بات یہ ہے کہ مختلف چارہ گروں نے ہمارے مرض کی تشخیص بھی مختلف کی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے اس "چارہ سازِ اعظم" کو لیجئے جو اپنے آپ کو "مولانا" کہلاتا ہے۔ اس کا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تباہی صرف

عدم پابندی مذہب کی وجہ سے ہے۔ اب آپ سوال کیجئے کہ مذہب سے ان کی کیا مراد ہے، تو دو جماعتوں کی طرف سے دو مختلف جواب ملیں گے۔ بہت زیادہ پست وادنیٰ ذہنیت رکھنے والے علماء یا یوں سمجھئے کہ حور و قصور کی توقع میں دنیا کو تج دینے والے مولوی، اس کا جواب یہ دیں گے کہ مذہب سے مراد صرف نماز روزہ کی پابندی ہے اور "ایمان مجمل و مفصل" کی تمام تصریحات پر بلاچون وچرا آنکھ بند کرکے یقین راسخ پیدا کرنا۔ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اس دُنیا کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا کہ وہ یہاں خوشحالی کی جستجو کرے، وہ پیدا ہوا ہے اُس عالم کے لئے جہاں ہر نعمت بغیر جستجو کے میسر آتی ہے اور جس کے حصول کی تدبیر یہی ہے کہ انسان ہر وقت خدا کا نام رٹتا رہے، اور اس دنیا کو قیدخانہ سمجھ کر کسی نہ کسی طرح بُرے بھلے اس سے گزر جائے، گویا اس کے نزدیک ہمارا مرض عین ہماری صحت ہے، اور ہمارا دنیاوی انحطاط عین ہمارا اخروی عروج۔

دوسری جماعت مذہبی علماء کی جو نسبتاً زیادہ ذی فہم ہے، درستی اخلاق کا بھی درس دیتی ہے۔ لیکن جب انسے سوال کیا جاتا ہے کہ اخلاق کی درستی کیونکر ممکن ہے تو وہ بھی اس کا انحصار مذہبی اعمال پر رکھتے ہیں۔ گویا انکے نزدیک بھی اصل چیز وہی صوم وصلوٰۃ کی پابندی قرار پاتی ہے۔ اب اگر ہم اس مذہبی پابندی کا کوئی معیار اپنے سامنے رکھنا چاہیں تو ظاہر ہے کہ علماء کرام سے بہتر نمونہ کوئی اور کیا مل سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے علماء کرام کی جماعت واقعی ترقی یافتہ ہے، کیا فی الحقیقت وہ عروج واستعلاء کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا اُن کے اخلاق دراصل بہت بلند ہیں، اور کیا یہ پانچ وقت ہاتھ پھیلا پھیلا کر "ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ" کی آواز بلند کرنے والے واقعی حسناتِ دین ودنیا کے حامل ہیں، یہ فیصلہ کرنے کے لئے ہم کو زیادہ غور وفکر کی ضرورت نہیں۔ اگر دنیاوی ترقی سے مراد صرف "بے منت وبے سوال وبے استحقاق" عیاشانہ حدتک اسباب معیشت ومعاشرت حاصل کر لینا ہے تو اس میں کلام نہیں کہ ہمارے بعض علماء کرام جنھوں نے ادارۂ بیعت وسلوک بھی قائم کر رکھا ہے یقیناً بڑی حدتک ترقی یافتہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ اسی طرح اگر عروج واستعلاء نام ہے صرف اس بات کا کہ جہلاء کی جماعت پر تقدس کا رعب قائم کرکے ان کو دست بوسی کے لئے جُھکا دیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ ہمارے بعض مذہبی رہنما "طارم اعلیٰ" سے بھی چند قدم آگے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن اگر ترقی کے مفہوم میں ذہنی و دماغی علو، اخلاقی پاکیزگی، اجتماعی احساس، اور ایثار ونفس کُشی کا جذبہ بھی شامل ہے تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جو جماعت ہمیں سب سے زیادہ صوم وصلوٰۃ کا حکم دیتی ہے وہی سب سے زیادہ ان خصوصیات سے بیگانہ نظر آتی ہے اور جو لوگ مذہبی پابندی ہی کو اصل علاج قرار دیتے ہیں وہی سب سے زیادہ آزار میں مبتلا۔ ضرورت نہیں کہ ان کے اخلاق وخصائل اور ان کی اندرونی زندگی پر تفصیل سے بحث کی جائے، کیونکہ اب یہ کوئی ایسا راز نہیں جس سے دنیا ناواقف ہو۔ بہت سے چہرے بے نقاب ہو چکے ہیں اور اُن کے خط وخال کی کراہت

سے بینائیاں بہت کافی طور پر مجروح ہو چکی ہیں۔

مذہبی پابندی کو ترقی کا ذریعہ بتانے والے لوگ ثبوت میں تاریخ اسلام کے اس دور کو بھی پیش کیا کرتے ہیں جب مسلمانوں نے توسیع حکومت اور اکتساب علوم وفنون کے لحاظ سے ساری دنیا کو مرعوب کر رکھا تھا۔ لیکن یہ دور وہ تھا جو امویین سے شروع ہوا اور بنو عباس پر ختم ہو گیا۔ پھر اگر اس تمام ترقی و فلاح کا سبب صرف پابندی مذہب کو قرار دیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں خلفاء راشدین بلکہ خود رسالتمآب کے عہد سے بھی زیادہ پابندی مذہب پائی جاتی تھی، حالانکہ ارباب نظر سے مخفی نہیں کہ مذہب کی اصل روح تو اسی وقت ختم ہو چکی تھی، جب عنانِ حکومت امیر معاویہ کے ہاتھ میں گئی اور مسلمانوں کی تمام ذہنی و علمی، ملکی و استعماری ترقیوں کا زمانہ وہی تھا جب اخلاق مذہب سے وہ یکسر بیگانہ ہو چکے تھے۔ الغرض مسلمانوں کی ترقی کا سبب ان کے مذہب کو قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا اور نہ دنیا میں کسی قوم نے صرف مذہب کی پابندی کی وجہ سے کبھی کوئی ترقی کی ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت دور حاضر کا ذہنی ارتقا ہے کہ خدا کی آبادی جتنی خدا سے دور ہوتی جاتی ہے اتنی ہی وہ آگے بڑھتی جاتی ہے۔ علاوہ علماء کے ایک گروہ ہمارے چارہ سازوں کا اور بھی ہے، جنھیں سیاسی رہنما کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان میں بھی دو جماعتیں ہیں۔ ایک وہ جو سیاسیات کو مذہب کا جزو قرار دیکر دونوں کو ساتھ ساتھ لیجانا چاہتی ہے۔ اس کی تشخیص یہ ہے کہ مسلمانوں نے چونکہ مذہب سے قائم کئے ہوئے رشتۂ سیاسی کو ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے اس لئے وہ برابر گرتے جا رہے ہیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو عالم اسلامی کا ایک جزو قرار دیں اور محض ہندوستانی ہونے کے علاقہ کو نظر انداز کر دیں۔ چنانچہ اس کے لئے "خدام کعبہ" کی ایک جماعت قایم کی گئی، "خلافت" کی حمایت کے لئے ایک ادارہ کھولا گیا، لاکھوں روپیہ چندہ وصول کیا گیا۔ مرکز خلافت کے مٹ جانے پر طرح طرح سے ماتم کیا گیا، نجد و حجاز کے مسایل پر شور و واویلا مچایا گیا، عراق و فلسطین کے معاملات میں احتجاجی جلوس نکالے گئے، ایران و ترکی کی مصیبتوں پر آہ و بکا کیا گیا، لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کا مسلمان بجائے بڑھنے کے گھٹتا ہی رہا اور یہ اخوت اسلامی کا رشتہ بھی بالکل نا استوار ثابت ہوا۔ دوسری جماعت سیاسی رہنماؤں کی وہ ہے جس نے محض سیاسیات سے دلچسپی نہ لینے کو ہمارے انحطاط کا سبب قرار دیا، چنانچہ اس نے ایک طرف مسلم لیگ قایم کی اور دوسری طرف کانگریس سے رشتہ جوڑا، لیکن مسلم لیگ نے جو کچھ کیا اور کر رہی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اور کانگریس میں شریک ہو کر جو سیاسی تفوق مسلمانوں نے حاصل کیا وہ بھی سب کو معلوم ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ اسوقت تک ہمارے لیڈروں اور اکابر قوم نے مختلف تشخیصیں ہماری بیماری کی قائم کیں اور مختلف علاج اس کے ازالہ کے لئے سوچے، لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے ایک بھی مفید ثابت نہ ہوا اور اب

حالت اس درجہ نازک ہوگئی ہے کہ اگر ہم اسے عالم نزع سے تعبیر کریں تو یہ تعبیر بالکل حق بجانب ہوگی۔ ہرچند مجھے رہنمایانِ ہند کی صف میں شامل ہونے کا فخر حاصل نہیں ہے، لیکن جماعت عوام کے ایک ادنی فرد ہونے کی حیثیت سے میں نے بھی اس مسئلہ پر بارہا غور کیا ہے اور تمام ناکامیوں کا سبب میں نے ہمیشہ ایک ہی قرار دیا ہے۔ وہ کیا ہے، اس کو میں آگے چلکر ظاہر کروں گا، فی الحال میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کسی ملک یا قوم کی صحیح ترقی کا مفہوم کیا ہے۔

انسان تمام مخلوقات میں صرف اس لئے ممتاز سمجھا جاتا ہے کہ وہ فطرت کی طرف سے قوتِ عقل و تمیز لیکر آیا ہے اور اس کا فطری مطالبہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ اس کے ذہن و دماغ کو آزادی کے ساتھ سوچنے اور کام کرنے کا موقعہ ملے، پھر چونکہ اس کا فقدان ایک قوم میں سب سے زیادہ اسی وقت پایا جاتا ہے جب وہ غیر کی محکوم ہو، اس لئے ایک ملک کا سب سے بڑا کارنامہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ آزادی کی کوشش کرے اور ایک قوم صحیح معنے میں اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب اس کے قوارِ ذہنیہ کو مفلوج کرنے کے لئے کوئی دوسری قوم اس پر حکمراں نہ ہو۔ چنانچہ اسی مقصد کا حصول کانگرس کا نصب العین ہے، یہی تمنا ہمارے مُسلم رہنماؤں کی ہے اور یہی اعلان ہمارے بعض علمارِ کرام کی طرف سے بھی کیا جاتا ہے۔ کانگرس پچاس سال سے زاید زمانہ گزرا کہ اس تگ و دو میں مصروف ہے، مسلمانوں میں بھی اس احساس کو پیدا ہوئے بیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے اور ہمارے مذہبی قایدین کے ایک حلقہ میں بھی کم و بیش دس بارہ سال سے یہ خواہش پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی جماعت اسوقت تک کامیاب نہیں ہوسکی اور نہ مستقبل قریب میں کوئی خاص توقع کامیابی کی نظر آتی ہے۔

پھر قطع نظر اس سے کہ ہندو مسلمانوں کے باہمی ناخوشگوار تعلقات سے سیاسی آزادی کی راہ میں کتنے موانع حایل ہوگئے ہیں یہ مسئلہ بجائے خود غور طلب ہے کہ اس مدعا کے حصول کی جو تدابیر اکابرِ وطن نے سوچی ہیں وہ کیا واقعی ایسی ہیں کہ اگر ہندو مسلم تعلقات خراب نہ ہوتے تو اسوقت تک ملک آزاد ہو چکا ہوتا۔ مجھے اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہے، کیونکہ ملک نام صرف اُن چند افراد کا نہیں ہے جو شہروں میں رہتے ہیں اور تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بلکہ وہ عبارت ہے اس ۵۷ فی صدی آبادی سے جو گاؤں میں رہتی ہے اور بالکل جانوروں کی سی زندگی بسر کرتی ہے ایک ملک میں کوئی سیاسی انقلاب ہمیشہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب عوام کے احساس میں تبدیلی پیدا ہو اور ہندوستان کی ناکامی کا راز یہی ہے کہ اس وقت تک عوام میں بیداری پیدا نہیں ہوئی اور نہ اس کے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ بعض سیاسی ہنگاموں اور عدم تعاون کی تحریک سے تھوڑی سی ہلچل عوام میں بھی پیدا ہوگئی ہو، لیکن یہ بالکل عارضی و وقتی چیز تھی اور بجائے احساس کے صرف تقلید و اتباع سے تعلق رکھتی تھی

آزادی کی روح جب تک انفرادی طور پر ہر ہر فرد میں پیدا نہ ہو اور ہر شخص خود اضطراری طور پر اپنی غلامی کی ذلت کو محسوس نہ کرنے لگے، ملک کبھی آزاد نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی ترقی کر سکتا ہے۔

اس لئے مرض کی تشخیص تو یہ ہو چکی کہ ملک کے افراد کی وہ حس جو غلامی کی ذلت و تکلیف کو ناقابل برداشت بنا دیتی ہے مُردہ ہو گئی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا صحیح علاج کیا ہو سکتا ہے۔ کیا ملک کی سیاسی انجمنوں کے جلسے اس گمشدہ احساس کو پھر واپس لا سکتے ہیں؟ کیا ہماری مذہبی پابندی ہمارے اندر یہ حس پیدا کر سکتی ہے؟ اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ ہماری موجودہ حالت خود شاہد ہے کہ ان میں سے کوئی طریقہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوا اور اس لئے ان پر اعتماد کرتے رہنا وقت ضائع کرنا ہے۔

میں نے جس حد تک اس مسئلہ پر غور کیا ہے، میرے نزدیک اس کا صرف ایک ہی علاج ہو سکتا ہے اور وہ عام تعلیم کی اشاعت ہے۔ "مس امی رستم جی" نے کسقدر صحیح لکھا ہے کہ "ہم کوہ ادریسٹ کی چوٹی تک پہونچنے کی کوشش تو کر رہے ہیں لیکن جہل عامہ کا اس سے زیادہ زبردست پہاڑ جو ہماری راہ میں حایل ہے اس کو دور کرنے کی تدبیر کوئی نہیں سوچتے"۔

آپ سمجھتے ہوں گے کہ ہندوستان کی تعلیمی حالت بہت ترقی کر رہی ہے کیونکہ ہر سال خدا معلوم کتنے نئے کالج و اسکول جاری ہوتے ہیں اور کتنے طلبہ اُن سے پڑھکر باہر آتے ہیں، لیکن شاید آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ باوجود شوق علم کے اس ہنگامہ کے ہندوستان کی ۳۵۲۸۳۷۷۷۸ آبادی میں صرف ۲۸۱۳۱۳۱۵ نفوس لکھنا پڑھنا جانتے ہیں (اعلیٰ تعلیم کا ذکر نہیں ہے کہ وہ تو اتنی بڑی آبادی کو دیکھتے ہوئے تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے) گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ مردوں میں تیرہ فی صدی اور عورتوں میں دو فی صدی تعلیم کا اوسط پڑتا ہے یعنی یہاں کے مرد ۸۷ فیصدی اور یہاں کی عورتیں ۹۸ فی صدی جاہل ہیں ــــ مس امی رستم جی لکھتی ہیں کہ "اگر امریکہ کی طرح اس جہل کا حساب لگایا جائے تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہندوستان کے تمام جاہل بسنے والے اگر ایک ایک گز کے فاصلہ سے دو قطاروں میں کھڑے کئے جائیں تو ۹۲۲۴۸ میل جگہ اُن کے لئے درکار ہوگی یعنی کرۂ ارض کے گرد تقریباً اُن کے چار حلقے نظر آئیں گے اور اگر جاہلوں کی یہ فوج ۲۵ میل روزانہ کے حساب سے کوچ کرے تو ایک مقررہ نقطہ سے گزرنے کے لئے ان کو دس سال ۳۵ دن درکار ہوں گے"۔ اسوقت ہندوستان میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد صوبہ متوسط اور آسام کی آبادی سے زیادہ نہیں ہے اور اس سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملک کا کتنا بڑا حصہ ہنوز جہل و وحشت کی زندگی بسر کر رہا ہے ــــ

ہم لوگ اپنی تمام جد و جہد میں مغربی اصول کو سامنے رکھ کر کام کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، چنانچہ ملک کی سیاسی آبادی میں بھی انقلاب و اصلاح کی وہی صورتیں تجویز کرتے ہیں جو ممالک یورپ میں اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ غور نہیں کرتے کہ وہاں کے لوگ ترقی کی جن راہوں سے گزر رہے ہیں، ان تک پہونچنے کا ذریعہ صرف تعلیم تھا یعنی وہاں سب سے پہلے جس چیز

کی طرف توجہ کی گئی وہ عام اشاعت تعلیم تھی۔ اسی طرح یہاں ہندو مسلم سوال اور اُردو ہندی نزاع میں ان ممالک یوروپ کو پیش کیا جاتا ہے جہاں مختلف عقاید و زبان کے لوگ بستے ہیں اور پھر بھی اتحاد و اخوت کی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہاں کی اس یکرنگی و یک جہتی کا سبب صرف تعلیم ہے۔۔ کانگرس کو نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزر گیا کہ وہ سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے، اسی طرح مسلم لیگ، جمعیتہ العلماء وغیرہ متعدد ادارے ایک زمانہ سے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں، لیکن نہ کانگرس اسوقت تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی اور نہ کوئی اور انجمن ۔۔ اگر وہ تمام قوت جو ان تدابیر میں صرف کی گئی ہے صرف اشاعت تعلیم میں صرف کیجاتی تو یقیناً آج ہندوستان کی حالت بالکل بدلی ہوئی نظر آتی اور وہ آواز جو اس وقت بار بار دُہرانے کے بعد بھی دلوں پر اثر نہیں کرتی خود لوگوں کے قلوب سے پیدا ہوتی ۔۔ اصل چیز صرف احساس ہے خواہ قومی ہو یا انفرادی اور اس کے پیدا کرنے کی تنہا تدبیر صرف تعلیم ہے ۔ آج ہر چہار طرف سے دیہاتی اصلاح کی آواز بلند ہو رہی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ بالکل بے معنی چیز ہے، نہ ریڈیو کے ذریعہ سے وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، نہ نسل کشی کے بہترین مویشی فراہم کرنے سے ان کے درد کا علاج ممکن ہے ۔ وہ بیمار ہیں صرف جہل و بے علمی کے، ان کی حالت تباہ ہے صرف اس لئے کہ وہ ان پڑھ ہیں اس لئے اگر واقعی ان کا علاج مقصود ہے تو ان کو تعلیم ہی کی طرف متوجہ کرنا چاہئے اور قوم و حکومت دونوں کو یہ کوشش کرنا چاہئے کہ کسی طرح ہندوستان کی ۹۰ فی صدی جاہل آبادی لکھنا پڑھنا سیکھ جائے ۔۔ ہمارے تمام اصلاحی ادارے بیکار ہیں، ہماری جملہ سیاسی انجمنیں لغو و مہمل ہیں، ہمارے مواعظ مذہبی یکسر مزخرفات ہیں کیونکہ ان سب کا اثر قبول کرنے کے لئے ضرورت ہے خاص ذہنیت و احساس پیدا کرنے کی اور وہ صرف تعلیم ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ کانگرس اسوقت تک کروروں روپیہ سیاسی تحریکات پر صرف کر چکی ہے لیکن اگر اسکا نصف روپیہ بھی ملک کا جہل دور کرنے کے لئے صرف کیا جاتا تو آج یہ حالت نہ ہوتی کہ پنڈت جواہر لال کھڑے ہوئے اشتراکیت کا درس دے رہے ہیں اور لوگ آنکھیں پھاڑے ہوئے ان کا منھ تک رہے ہیں۔

آیندہ جنوری ۳۷ء کا "نگار"

مینجر کی طرف سے جو اشتہار جنوری سنہ ۳۷ء کے نگار کے متعلق شائع ہو رہا ہے وہ قارئین نگار نے ملاحظہ کیا ہوگا اور غالباً اس کی نوعیت کا اندازہ بھی ایک حد تک کر لیا ہوگا۔ میں آج ذرا تفصیل سے بتانا چاہتا ہوں کہ جس چیز کے انتظار میں آپ کو مبتلا کیا جا رہا ہے وہ اسوقت تک کے تمام سالناموں سے بالکل جدا چیز ہے۔

یہ خصوصیت غالباً نگار ہی کو حاصل ہے کہ ہر نئے سال کا نیا پرچہ کسی نہ کسی مخصوص موضوع کے لئے وقف ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں اس وقت تک ادبی و انتقادی حیثیت سے جو مواد پیش کیا جا چکا ہے وہ سوائے نگار کے صفحات کے آپ کو کسی اور جگہ میسر نہیں آسکتا۔

جس وقت گزشتہ جنوری کا رسالہ "ہندی شاعری" پر شائع ہوچکا تو مجھے آئندہ جنوری کے متعلق فکر ہوئی اور بعض احباب سے مشورہ کیا۔ کسی نے کہا کہ اسے فارسی شاعری کے لئے وقف ہونا چاہئے، بعض نے عربی شاعری کی طرف متوجہ کیا، کسی نے مصحفی کا نام لیا اور کسی نے موجودہ دور کے شعراء اور ادباء پر نقد و تبصرہ ضروری خیال کیا۔ لیکن میں نے ان میں سے کسی مشورہ کو پسند نہ کیا، کیونکہ اول تو مسلسل دو سال تک شاعری کے موضوع پر سالنامے نکالنے کے بعد پھر اسکی تکرار مناسب نہ معلوم ہوئی اور دوسرے اس لئے بھی کہ لکھنے والے کہاں سے پیدا کرتا اور خود لکھتا تو لوگوں کی خواہش تنوع پوری نہ ہوتی۔ جن حضرات نے نگار کی روش کا مسلسل مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی کہ رسالہ کا افادی پہلو بہ نسبت خیالی پہلو کے زیادہ قوی ہوتا جاتا ہے، یعنی میری یہ خواہش روز بروز زیادہ سنگین ہوتی جاتی ہے کہ لوگوں کے سامنے خواب و خیال کا لٹریچر پیش کرنے کے بجائے کوئی ایسی چیز پیش کیجائے جو بجائے قلب کو متاثر کرنے کے زیادہ تر دماغ کو متاثر کرے اور بجائے تخیل کے عملی قوت کے لئے محرک ثابت ہو، چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ جنوری ۳۷ء کے رسالہ میں زیادہ تر کام کی باتیں کی جائیں اور وہ تمام باتیں ضروری ہوں۔ وہ حضرات جو انشاء لطیف کے شائق ہیں ان کی تسکین کے لئے اصحاب کہف کا مکمل ڈرامہ پیش کیا جائے گا جو عربی سے اخذ و اقتباس کیا گیا ہے اور نہایت بلند تخیل کا نمونہ ہے جو حضرات ندرت بیان اور انتقادی لٹریچر پسند فرماتے ہیں وہ غالباً یہ سنکر خوش ہوں گے کہ ایک نہایت بسیط مضمون اُن خطوط کے متعلق ہوگا جو آسکر وائلڈ نے سارا برنہارڈ کو لکھے تھے۔ وائلڈ خلاق معانی تھا اور ندرت بیان، نزاکت تخیل اور طرز ادا کے تنوع میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ یہ مضمون کتنا دلکش اور کس قدر مرصع ہوگا۔ مذہبی مباحث سے دلچسپی لینے والے حضرات کے لئے مسئلۂ خلافت و امامت پر ایک ایسا بسیط مضمون شائع کیا جائے گا جو شیعی نقطۂ نظر سے آخری لفظ کی حیثیت رکھے گا۔ ان کے علاوہ اور جو مقالات ہوں گے وہ تحقیقات تاریخی، ارتقاء علوم و فنون اور تازہ ترین معلومات سے متعلق ہوں گے اور حد درجہ شگفتہ و سلیس زبان میں لکھے جائیں گے اور اس لئے امید ہے کہ جنوری ۳۷ء کا نگار ہر شخص کے ذوق کی رعایت رکھنے والا ثابت ہوگا اور بہت پسند کیا جائے گا۔

راز حیدر آبادی سے

حال ہی میں ایک طویل مقالہ مسئلۂ خلافت و امامت پر میرے محاکمہ کے جواب میں کسی صاحب راز حیدر آبادی کی طرف سے موصول ہوا ہے۔ چونکہ فاضل مقالہ نگار نے اپنا پتہ درج نہیں کیا اس لئے مجبوراً نگار کے ذریعہ سے ان کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ مناظرانہ انداز کا کوئی مضمون اس سلسلہ میں شائع نہیں ہوسکتا۔ یہ "قال اقول" قسم کا انداز گفتگو نہ مجھے پسند ہے اور نہ پبلک میں مقبول۔ اگر انھیں کچھ لکھنا ہے تو تحقیقی انداز میں لکھیں اور طرز بیان میں کوئی ایسی خشونت پیدا نہ ہونے دیں جس سے کھلم کھلا یہ معلوم ہوجائے کہ آپ باوجود ادعائے آزاد خیالی کے کسی ایک مخصوص جماعت سے تعلق رکھنے والے نہایت سخت قسم کے متعصب انسان ہیں۔ اگر وہ اپنا مضمون واپس لینا چاہتے ہیں تو اپنا پتہ براہ راست منیجر نگار کو لکھ بھیجیں۔

تاریخ صحافت پر ایک سرسری نظر

اب سے سوا سو سال پہلے ہندوستان میں صحافت و پریس کی جو حالت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے :-

لارڈ منٹو ہندوستان کے وائسرائے اور نواب سکندر جاہ بہادر فرمانروائے دکن تھے اُس زمانے کے رزیڈنٹ سیڈن ہام نے ولایت سے ایک ہوا بھرنے کا پمپ، ایک چھاپنے کی مشین اور ایک جنگی جہاز منگوا کر نواب سکندر جاہ بہادر کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا۔ مگر حکومت برطانیہ کو اعتراض ہوا کہ پریس جیسی مشین بادشاہ وقت کو کیوں سپرد کی گئی۔ رزیڈنٹ نے اس کا یہ جواب پیش کیا کہ حیدرآباد میں اس مشین کے رکھنے کے متعلق حکومت برطانیہ کو اگر کوئی تشویش ہوئی تو مشین توڑ کر ناکارہ کر دیجائے گی یہ تھا اُس زمانہ میں مطبع کا خوف ——— سترویں صدی کے وسط میں ایک انگریز نے بلا اجازت اخبار نکالا تھا تو اس کو حکومت نے موت کی سزا دی تھی۔ ہندوستان میں بھی ۱۷۴۴ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان بعض اڈیٹروں کو جلاوطن کیا گیا اور اسی اُصول کے ماتحت اہل برطانیہ کو ابتدا میں یہ گوارا نہ تھا کہ ہندوستان میں اخبارات جاری ہوں خاصکر دیسی اخبارات کی اشاعت اور ترقی سے اُنھیں کوئی خوشی نہ تھی۔

اخبارات کی ابتداء

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا اخبار "اکٹا ڈرنا" نامی رومتہ الکبریٰ سے نکلا۔ ۶۹۱ ق م میں روزنامچہ کے طور پر اس اخبار کی نقلیں دفاتر میں رکھی جاتی تھیں، کیونکہ فن طباعت اس وقت تک عام نہ ہوا تھا۔ طباعت کا موجد ننتنگ نامی چینی کا زرگر تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی لکڑی کی تختیوں پر حروف کھود کر کاغذ پر دبا تا تھا اور اس طریقہ سے طبع کیا ہوا ایک اخبار ۶۱۹ء ق۔م) میں دارالحکومت پیکنگ سے جاری ہوا تھا اس لئے سب سے پہلا اخبار یہی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر اب یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ فن طباعت ۱۴۵۴ء میں رائج ہوا۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ ترقی یافتہ شکل میں ۱۴۵۴ء سے طباعت کا رواج ہوا لیکن باوجود اس کے اخبارات طبع نہ ہوتے تھے بلکہ کتابت ہو کر دست بدست دئے جاتے تھے چنانچہ دریافت امریکہ (۱۴۹۳ء) کی خبر کولمبس کے جس خط میں درج تھی، اس کی صدہا نقلیں بطور

اخبار لوگوں میں تقسیم ہوئیں۔ [۱]

یورپ میں اخبارات کا آغاز مطبع کی سہولت پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے سنہ ۱۶۰۹ء میں جرمنی میں اخبار شائع ہوا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ سنہ ۱۵۸۸ء میں سب سے پہلا اخبار انگلستان سے نکلا، مگر بعد کو تحقیقات سے ثابت ہوا کہ سنہ ۱۶۲۲ء میں پہلا پرچہ نکلا تھا۔ یہ پرچے کتابچے (پمفلٹ) کی شکل

---

[۱] ذیل کی جدول سے ممالک عالم میں اخبار نویسی کی ابتدا ظاہر ہوتی ہے۔

نام ملک	نام اخبار	سن اجرا
۱۔ چین	پیکن گزٹ	سنہ ۹۰۰ء
۲۔ اٹلی	گزیٹیا	سنہ ۱۵۰۰ء
۳۔ جرمنی	مشہور فرانکفورٹر جرنل	سنہ ۱۶۰۹ء ـ سنہ ۱۶۱۵ء
۴۔ برطانیہ	ویکلی نیوز	سنہ ۱۶۲۲ء
۵۔ فرانس	گزٹ دی فرانس	سنہ ۱۶۳۱ء
۶۔ ڈنمارک		سنہ ۱۶۶۳ء
۷۔ ناروے		سنہ ۱۶۷۳ء
۸۔ سویڈن		سنہ ۱۶۸۰ء
۹۔ امریکہ		سنہ ۱۶۸۹ء
۱۰۔ روس		سنہ ۱۷۰۳ء
۱۱۔ اسپین		سنہ ۱۷۲۶ء
۱۲۔ ہندوستان	ہکی گزٹ	سنہ ۱۷۸۱ء
۱۳۔ ترکی		سنہ ۱۷۹۵ء
۱۴۔ مصر		سنہ ۱۸۲۸ء
۱۵۔ ایران		سنہ ۱۸۵۱ء
۱۶۔ ٹیونس		سنہ ۱۸۶۲ء
۱۷۔ مالٹا		سنہ ۱۸۶۹ء
۱۸۔ مراقش		سنہ ۱۹۰۵ء

سنہ ۱۸۸۲ء میں دنیا کے تمام روزانہ اخبارات کی تعداد حسب ذیل تھی:۔

نام ملک	تعداد اخبارات
۱۔ یورپ	۲۴۰۳
۲۔ ایشیا	۱۵۴
۳۔ افریقہ	۲۵
۴۔ شمالی امریکہ	۱۱۳۶
۵۔ جنوبی امریکہ	۲۰۸
۶۔ آسٹریلیا	۹۴
جملہ	۴۰۲۰

(نیوز پیپر ڈائرکٹری آف دی ورلڈ مطبوعہ سنہ ۱۸۸۲ء)

میں عام طور سے ہفتہ میں ایک بار شائع ہوتے تھے۔

انگلستان میں، دارالمغرب کی مانند مطابع بھی اولاً شاہی ملک سمجھے جاتے تھے اور بادشاہ کی اجازت حاصل کئے بغیر مطبع قائم کرنے اور کتابیں شائع کرنے پر سزا دیجاتی تھی۔

یہ اختیار شاہی، ۱۶۴۱ء میں پارلیمنٹ کو تفویض کیا گیا اور ۱۶۴۳ء میں پارلیمنٹ نے قانونِ مطابع نافذ کیا۔

۱۸۹۰ء میں کل اخبارات (۲۱۰۰۰) تھے۔ اور ۱۹۰۰ء کے ختم پر اخبارات کی تعداد بہ تفریق ممالک عالم یہ تھی:-

برطانیہ و آئرلینڈ	۲۹۰۲	سیریا	۶
امریکہ	۱۵۹۰۴	ہندوستان	۶۰۰
فرانس	۲۴۰۰	سیلون	۱۰
جرمنی	۳۲۷۸	سیام	۵
آسٹریا	۳۹۳	ڈنمارک	۱۴۵
ہنگری	۱۷۱	آئس لینڈ	۳
سویڈن	۲۱۳	ناروے	۱۳۲
بلغراد	۱۵	بلجیم	۲۹۰
مانٹی نگرو	۲	ہالینڈ	۳۱۲
روم	۲۲	ہمبرگ	۱۲
ایران	۳	روس	۲۸۰
جاپان	۱۵۰	اسپین	۳۴۸
جزائر شرق الہند	۳۰۹	پرتگال	۷۹
جنوبی افریقہ	۱۰۹	سوئٹزرلینڈ	۶۰۰
مغربی افریقہ	۱۰	یونان	۴۷
وسط افریقہ	۷۶	رومانیہ	۴۷
مصر	۲۱	سرویا	۲۴
کینیڈا	۷۴۲	کوئنس لینڈ	۱۰۹
جنوبی امریکہ	۳۴۰	جنوبی آسٹریلیا	۴۴
اٹلی	۲۵۱	وکٹوریہ	۳۱۰
مغربی آسٹریلیا	۱۸	تسمانیہ	۱۸
ادٹاگو	۲۸	ہاکس بے	۱۱
اسٹریٹ سٹیل منٹس	۱۲	کوچین چینا	۴
جزائر غرب الہند	۱۲۹	نیو ساؤتھ ویلز	۲۲۲
کینٹربری	۲۳	سٹرری	۳۶

جملہ ۳۱۰۲۲

(انسائکلوپیڈیا برٹانکا)

۱۶۴۱ء سے ۱۶۴۳ء تک یعنے پندرہ سال کے اندر انگلستان میں تین سو (۳۰۰) اخبارات جاری ہوئے جن میں صرف (۳۳) اخبار ایک سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔

اسی زمانہ میں (۱۶۲۵ء) جان ڈنک ہام نے پارلیمنٹ اسکوٹ کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس میں وہ خبروں کو اپنی رائے کے ساتھ شائع کرتا تھا اور اس لئے سب سے پہلا اخبار یہی ہے جس نے ایڈیٹوریل لکھنے کی اختراع کی۔ اس کی تنقید سے سیاسی حلقوں میں اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے۔ اور اس کو قید بھگتنا پڑی لیکن اس نے اخبار نویسی ترک نہیں کی اور جیل سے رہا ہونے کے بعد ایک اخبار اور (ماڈریٹ ان ٹیلی جنس) کے نام سے ۱۶۶۳ء میں جاری کیا۔

روزانہ اخبار انگلستان میں سب سے پہلے ۱۶۹۰ء میں جاری ہوا۔ آلیور ولمان نے ایک روزنامہ جاری کیا مگر یہ پرچہ صرف دو روز چلا۔ اس کا نام (پرفکٹ ڈرنل) تھا۔ اس میں پارلیمنٹ کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔

۱۶۶۵ء میں لنڈن گزٹ نامی اخبار سرکاری حمایت میں جاری ہوا۔ یہ سرکاری احکام قانون، قواعد وغیرہ کے علاوہ حکومت کی خبروں کو عوام میں پہونچایا کرتا اور ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا۔ یہ اسوقت تک جاری ہے۔

دیگر ممالک میں اب اس قسم کے سرکاری گزٹ عام ہو گئے ہیں۔ دنیا کی اکثر حکومتوں نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ اپنے کاروبار اور اغراض و مقاصد سے وقتاً فوقتاً رعایا کو مطلع رکھنا مناسب ہے۔ معلومات عامہ کے دفاتر کا وجود بھی اسی اصول کا منت کش ہے۔ ۱۷۰۰ء کے بعد ایڈیسن۔ رچرڈ اسٹیل جیسے فاضل اشخاص نے اخبار نویسی اختیار کی اور لوگوں میں علمی و معاشرتی مقالوں کا ذوق پیدا کیا۔

حکومت کی جانب سے ۱۷۱۲ء میں اخباروں پر ٹیکس عائد کیا گیا۔ متعدد اخبار نویسوں کے خلاف دعوے دائر کئے گئے۔ ۱۷۶۲ء میں "نارتھ برٹین" کے اڈیٹر جان ولکس پر بغاوت کا الزام عاید کیا گیا۔ عوام میں اس سے ہمدردی پیدا ہوئی اور اس کے اخبار کی اشاعت بڑھنے لگی۔ ۱۷۶۹ء میں جونیس ایک زبردست نامہ نگار تھا جو اسوقت کے سیاسی معاملات پر سخت تنقیدی مضامین "پبلک اڈوائزر" میں شائع کیا کرتا تھا۔

اس اخبار سے پبلک میں اخبار بینی کا مذاق پیدا ہوا۔ انگلستان اور فرانس کے مابین وقتاً فوقتاً جنگوں کے برپا ہونے اور ہندوستان میں انگریزوں کی آمدرفت کے باعث اہل انگلستان میں دیگر ممالک کی خبروں کو معلوم کرنے کا شوق بڑھتا گیا۔

۱۸۵۱ء میں اخباروں کی تعداد یہ تھی :-

لنڈن	۱۵۹	اسکاٹ لینڈ	۱۱۰
انگلستان	۲۲۴	آئرلینڈ	۱۰۲

۱۷۷۱ء میں اخباروں پر جو قیود عائد تھے اُٹھا لئے گئے۔

۱۸۵۵ء میں ٹیکس بھی منسوخ ہوگیا۔ اس وقت سے ابتک انگلستان کی اخبارنویسی میں بغیر کسی مزاحمت کے نمایاں ترقی ہو رہی ہے۔

انگلستان کے چند مشہور اخبارات

انگلستان موجودہ روزناموں میں "مارننگ پوسٹ" سب سے قدیم ہے، جو ۱۷۷۲ء میں جاری ہوا۔

لنڈن ٹائمز ۱۷۸۵ء میں نکلا۔ یہ انگلستان کا زبردست ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے نامہ نگار دنیا کے تمام ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے مقالے نہایت گرانقدر، وزنی اور موثر ہوتے ہیں۔ یہ دنیا کا نہایت باوقعت اخبار ہے۔

تیسرا مشہور روزنامہ "ڈیلی میل" یہ ۱۸۹۶ء میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر نے پندرہ ہزار پونڈ کے سرمایہ سے اس کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۱ء میں اس کا سرمایہ اکیس لاکھ پونڈ ہوا۔ یہ اخبار ایسوشیٹیڈ نیوز پیپر کمپنی کی ملکیت ہے۔ ڈیلی میل کا مطبع بہت بڑا ہے اس میں متعدد مشینیں کام کرتی ہیں اور اخبار کی تقسیم کے لئے سیکڑوں موٹر کام کرتے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں اس کی روزانہ اشاعت (۱۲۰۲۲۹۴) تھی۔ آج اسکی اشاعت بیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔

لندن کے روزناموں میں "مانچسٹر گارڈین" بھی مشہور ہے۔ اس کے مضامین سنجیدہ ہوتے ہیں۔

"پنچ" ایک مشہور ظریفانہ اخبار ہے۔ اس میں مشہور اشخاص کی تصویروں کو مختلف کارٹونوں میں ظاہر کیا جاتا ہے اور ان کے طرز عمل اور حرکات و سکنات پر مذاقیہ تنقید کی جاتی ہے۔ واقعات، قصے کہانی کی صورت میں شائع کئے جاتے ہیں۔ اس اخبار کا مذاق نہایت مہذب ہوتا ہے۔

لندن میں سب سے پہلا باتصویر اخبار "ڈیلی گرافک" نکلا۔ عورتوں کے واسطے ۱۹۰۳ء میں مخصوص اخبار "ڈیلی مرر" شایع ہوا۔

مذکورۂ بالا اخبارات کے علاوہ انگلستان کے مقبوضات میں متعدد اخبارات مختلف مقاصد و اغراض کے ساتھ مختلف فنون و علوم پر شائع ہوتے ہیں۔

یہ تمام اخبارات کافی فائدہ کے ساتھ چل رہے ہیں اور بہت کم اخبار ایسے ہیں جو گھاٹے میں رہتے ہوں۔ کسی اخبار کو نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس کو دوسرے اخبار کے ساتھ ضم کر دیا جاتا اور مشترکہ قوت اس کو نقصان سے محفوظ کر دیتی ہے۔

فرانس کے اخبارات

پیرس کا اخبار لا کٹی جرنل کے دفتر میں ایک ہزار ملازم ہیں۔ دو لاکھ روپیہ کا

کاغذ ماہانہ صرف ہوتا ہے۔ بارہ لاکھ پرچے چھپتے ہیں۔ اور پچیس ہزار ایجنسیاں کھلی ہوئی ہیں۔

دوسرا اخبار "طان" ہے جو بارہ لاکھ روپیہ سالانہ صرف تاروں پر صرف کرتا ہے۔ اس کے دفتر میں (۲۰۰۰) ملازم ہیں اور اس کے (۱۰۰) اڈیٹر ہیں جو سب کے سب جید عالم و فاضل ہیں۔ ان میں سے کسی کا مشاہرہ چار ہزار روپیہ ماہانہ سے کم نہیں۔ نامہ نگاروں کو ایک ایک مضمون کا معاوضہ بعض وقت (۵۰۰۰) روپیہ تک دیا جاتا ہے اور اس کی اشاعت کے واسطے اسپشل لوکل ٹرین سے کام لیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اخبار کی ابتدار

صحیح طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ ہندوستان میں سب سے پہلا اخبار کب، کس شہر اور کس کے زیر ادارت شائع ہوا، لیکن اسقدر مسلّم ہے کہ سنہ ۱۷۴۴ء میں گورنمنٹ گزٹ نکلا جس میں سرکاری خبریں چھپتی تھیں، اور وارن ہیسٹنگز کے زمانہ میں ہکی نامی شخص نے سنہ ۱۷۸۱ء میں اپنے نام سے ہکی گزٹ شائع کیا۔ اسی کو سب سے پہلا اخبار تصور کیا جاتا ہے۔ اسوقت کے اخباروں میں کلکتہ کا ایک قدیم اخبار انگلش مین تھا جو (۱۰۰) سال تک جاری رہ کر گزشتہ سال بند ہوگیا۔ سنہ ۱۸۳۲ء تک ہندوستان میں صرف چھ انگریزی اور پانچ دیسی اخبارات شائع ہوتے تھے۔ لیکن سنہ ۱۸۶۰ء تک ان کی تعداد (۴۴) تک پہونچ گئی، ملکیوں کے زیر ادارت انگریزی زبان کا پہلا اخبار (انڈین مرر) سنہ ۱۸۶۳ء میں کلکتہ سے جاری ہوا۔

مشہور انگریزی "امرت بازار پتریکا" سنہ ۱۸۶۶ء میں نکلا۔ اور بنگالی نام کا انگریزی اخبار سنہ ۱۸۶۸ء میں اور بنگالی زبان کا "انند بازار" سنہ ۱۸۶۸ء میں جاری ہوا۔ بمبئی میں سنہ ۱۸۵۱ء میں گجراتی زبان کا پہلا اخبار زیر ادارت دادا بھائی نوروزجی شائع ہوا۔ پونا کا مرہٹی "مانا پران" سنہ ۱۸۴۷ء میں جاری ہوا۔ اردو کا سب سے پہلا اخبار سنہ ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے مولوی اکرام علی صاحب نے جاری کیا۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد باقر نے اردو اخبار نکالا۔ اور سنہ ۱۸۳۷ء میں سید الاخبار شائع ہوا۔ مرزا پور سے خیر خواہ ہند نامی سب سے پہلا رسالہ سنہ ۱۸۳۷ء میں ایک پادری صاحب کی ادارت میں نکلا۔ سنہ ۱۸۶۷ء میں بمقام کلاوگی کناری اخبار شائع ہوا۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں دھار وار میں تین اور بلگام میں تین اخبار نکلے۔ میسور میں پہلا مطبع سنہ ۱۸۴۰ء میں گیارٹ نامی پادری نے قایم کیا۔ سنہ ۱۸۱۶ء سے سرکاری گزٹ شائع ہونے لگا۔

اس کے علاوہ میسور سے اسٹار۔ اندا تا نت پتر (کناری) اخبارات کے علاوہ ڈیلی پوسٹ اور ایوننگ میل نامی انگریزی اخبار ایک مدت سے شائع ہو رہے ہیں۔

تلنگی زبان کے مشہور اخبار

(۱) "اندھرا پتریکا" تلنگی زبان کا یہ سب سے زیادہ مشہور اور مقبول اخبار ہے۔ اس نے تلنگی زبان کی احیا میں بڑا حصہ لیا ہے

اور یہ لٹریچر میں جدید تحریکات کا حامی ہے۔

(۲) آندھرا پرشاد پتریکا - بڑا ممتاز اخبار ہے۔

(۳) بھارتی - تحقیقی مقالے شائع کرتا ہے۔

(۴) ساہتی - نظمیں بہت زیادہ شائع کرتا ہے - جدید طرز کی حمایت کرتا ہے۔

(۵) شاردا - قدیم اور جدید خیال کے لوگوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۶) سرسوتی اور نجواتی - یہ دونوں غیر مطبوعہ تصانیف بہ اقساط شائع کرتے ہیں لیکن نجواتی بند ہوگیا ہے۔

جنگ عظیم کے بعد سے ہندوستان کے اخباروں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہوگا۔

(۱)	سنہ ۱۹۱۸ء	۸۸۳	(۶)	سنہ ۱۹۲۳ء	۱۳۶۳
(۲)	سنہ ۱۹۱۹ء	۹۴۱	(۷)	سنہ ۱۹۲۴ء	۱۴۰۱
(۳)	سنہ ۱۹۲۰ء	۱۰۱۷	(۸)	سنہ ۱۹۲۵ء	۱۴۷۸
(۴)	سنہ ۱۹۲۱ء	۱۰۹۴	(۹)	سنہ ۱۹۲۶ء	۱۴۸۵
(۵)	سنہ ۱۹۲۲ء	۱۲۸۲	(۱۰)	سنہ ۱۹۲۷ء	۱۵۲۵

ماہوار رسالے ان کے علاوہ ہیں - یہ تعداد صرف اخبارات کی ہے۔

دکن میں صحافت کا آغاز

دار الطبع سنہ ۱۸۶۹ء میں قائم ہوا - سنہ ۱۸۳۸ء میں پوسٹ آفس رزیڈنسی میں تھا - سنہ ۱۸۶۸ء سے افضل گنج میں قائم ہوا - اور ریل سنہ ۱۸۷۴ء میں جاری ہوئی - ٹپہ اور ریل کے وجود سے دکن میں اخبارات شائع کرنے کی سہولت پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے سنہ ۱۸۶۱ء میں رسالہ طبابت کا اجرا عمل میں آیا - اس کے بعد خورشید دکن سنہ ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا - سنہ ۱۸۷۸ء میں شفیق اور نظام الاخبار نکلے - عہد عثمانی سے پہلے مستقل طور پر صرف ایک پرچہ مشیر دکن روزانہ شائع ہوتا تھا مگر اب اس کے علاوہ رہبر دکن، صبح دکن، صحیفہ، منشور، پیام روزانہ اور الاعظم - نظام گزٹ، رعیت ہفتہ وار نکلتے ہیں - الاعظم حال میں بند ہوگیا ہے باقی سب اخبار ملک کی مفید خدمت انجام دے رہے ہیں - رہبر دکن سب سے زیادہ اشاعت رکھتا ہے۔

امریکہ کے اخبارات

امریکہ میں اخباروں کی اشاعت روز افزوں ترقی پر ہے - سنہ ۱۹۱۴ء میں اس ملک میں اخبارات ۲۰ کروڑ ۵۰ لاکھ کی تعداد میں شائع ہوتے تھے - اکثر روزنامے بڑے سائز کے ۲۴ صفحوں پر ہوتے ہیں - علاوہ اس کے یکشنبہ کی خصوصی اشاعت ایکسو صفحات

پر محیط ہوتی ہے۔

انگلستان اور امریکہ میں اخبارات تعلیم کے زبردست ذرائع تصور کئے جاتے ہیں۔ امریکہ کے اکثر اخبارات سرکاری عہدہ داروں کی بے عنوانیوں پر سخت تنقید کر کے ان کو ادائے فرائض کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

برطانیہ کے اخبار نویسوں کی انجمن

برطانوی اخبار نویسوں نے ایک انسٹی ٹیوشن قائم کر لی ہے، جس کے زیر اثر وہ سالانہ کانفرنس منعقد کرتے ہیں اور اُس کے انعقاد کے لئے بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس انجمن کے ارکان برطانیہ کے مشہور اخبار نویس ہیں۔ انجمن کی رکنیت کے لئے بہت سخت شرائط ہیں تاہم اس کے ارکان کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے۔ یہ انجمن اخبار نویسوں کی بہبودی اور خوشحالی پیش نظر رکھتی ہے۔ اخبار نویسوں میں جب کوئی فرد مشکلات میں گھر جاتا ہے تو انجمن اس کی مدد کرتی ہے۔ جب کوئی اخبار نویس اپنے خاندان کو مفلسی میں چھوڑ کر مر جاتا ہے تو اس خاندان کی مدد کے واسطے انجمن کا سرمایہ کام آتا ہے۔ جو اخبار نویس مدت تک کام کر کے تھک جاتے ہیں، ان کی تفریح طبع اور آرام و راحت کے سامان بہم پہونچائے جاتے ہیں۔ اخبار نویسوں کے لئے مالک اور مالکوں کے لئے اخبار نویس فراہم کئے جاتے ہیں ایک ذیلی مجلس اخبار نویسوں کی قائم ہے اور ایک ماہوار رسالہ نکالتی ہے اس انجمن کے جلسوں میں انگلستان کے وزیر اعظم اور ارکان کابینہ وغیرہ شریک ہو کر اخبار نویسوں کے ساتھ یکجہتی اور ہمدردی ظاہر کرتے ہیں اور انجمن کی ترقی کے ذرائع مہیا کرتے ہیں۔

اخبار کے اثرات

یہ کہنا بجا ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں عوام کی بیداری، اور ذمہ دار حکومت کے حصول کی تحریک میں اخباروں کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ جلسوں میں تقریریں سننے والوں کی تعداد کم ہوتی ہے لیکن اخبار پڑھنے والے بکثرت ہوتے ہیں۔ جلسے اور مباحثے شہروں تک محدود ہیں۔ برخلاف اس کے اخبار قصبات اور دیہات تک پہونچتے ہیں۔ جلسے سال میں چند ہی منعقد ہو سکتے ہیں، مگر اخبارات ہر ہفتہ اور ہر روز دیکھے جا سکتے ہیں۔ علاوہ بریں جلسوں کی تقریروں کو فراہم کرنا، ان کو سمجھانا اور ان کو ان اشخاص تک پہونچانا جو جلسوں میں نہیں تھے، یہ سب کام اخبارات انجام دیتے ہیں۔ اس لئے ہم بلاشک و شبہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پبلک معاملات کو سلجھانے کا اخبار ایک زبردست اور موثر ذریعہ ہے۔

اب یہ توقع بیجا نہیں ہے کہ برٹش انڈیا کی حکومت رفتہ رفتہ عوام کے ہاتھوں میں آجائے گی۔ اور جمہوریہ حکومت کا اخبار ایک اہم جزبن جائے گا۔ اور پبلک کا حقیقی ترجمان ہوگا۔ انگلستان میں اخبار کو سلطنت کا چوتھا رُکن کہا جاتا ہے۔ اخبار ملک کی روزانہ زندگی کا آئینہ ہے۔ اس لئے عوام کی قابلیت اور موزونیت کو جانچنے کے واسطے اخباروں کو دیکھنا کافی ہوگا۔

دیسی اخبارات اور ملک کے اعلیٰ طبقوں کی بے التفاتی

انگلینڈ۔ امریکہ۔ فرانس۔ جرمنی اور جاپان کے اخبارات کو جو درجۂ قبول اور شہرت حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ ان اخبارات کا مقابلہ ہمارے ملک کے اخبارات نہیں کر سکتے۔

ہندوستان کے انگریزی اخباروں میں تین چار کے سوا کسی اخبار کی حالت اچھی نہیں۔ اکثر انگریزی اخباروں کی حالت بہت سقیم ہے۔ اس بے التفاتی کو دور کرنے کی کوشش کرنا ہمارا پہلا فرض ہے، یہ کام ہمارے ذاتی فائدے کے لئے نہیں بلکہ ملک کے مفاد کے لئے ضروری ہے۔ انگریزی اخبارات کو جو وقعت دیجاتی ہے اس کی نصف اہمیت بھی ملکی اخبارات کو دی جائے تو دیسی صحافت چمک اُٹھے۔

اخبار کی ظاہری خوبصورتی

اگر اخبار کی کتابت، طباعت اور ظاہری شکل وصورت اچھی نہو تو وہ زیادہ خریدار فراہم نہیں کر سکتا۔ عوام کا یہ رجحان نہیں ہے کہ وہ اخبار بینی کو بطور ایک فرض کے انجام دیں۔ اخبار بینی کا شغل اس لئے ہوتا ہے کہ تردد رفع ہو یا تفریح طبع کی جائے یا بعض خبریں معلوم کی جائیں۔ ایسی حالت میں بھدے کاغذ پر اخبار طبع کرنا گویا پبلک کو مکدر کرنا اور نقصان کو دعوت دینا ہے۔

"اخبار کی کتابت۔ طباعت اور صحت کا، کوشش اور تردد کے ساتھ، خیال رکھنا اور نیز تاریخ معینہ اور وقت مقررہ پر شائع کرنا ضروری ہے۔"

اخبار کا مواد

اخبار کے مواد کو ہم چار اجزا میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔
(۱) خبریں (۲) بحث ورائے (۳) تعلیمی مقصد (۴) اشتہارات۔

خبریں:۔ ہمارے اخبارات اس معاملہ میں انگریزی اخبارات کے متبع ہیں۔ خبروں کے انتخاب اور ترتیب میں ایک سلیقہ، ایک تسلسل درکار ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ عوام کے روزمرہ کاروبار کے لئے ضروری معلومات فراہم ہوں۔ خبریں جب تک معتبر ذرائع سے نہ پہونچیں اس وقت تک ان کا شائع کرنا مناسب نہیں، ہر خبر کا پورا ثبوت موجود ہونا ضروری ہے۔

حکومت کی تبدیلیاں، علمی ترقیاں، معاشرتی مجلسیں، اُن کی رودادیں، مشہور لوگوں کے حالات، تجارتی تغیرات، ایجادات واختراعات وغیرہ کا اندراج اخبارات میں ہونا چاہئے۔ اگر یہ مواد اپنے ہی ملک سے متعلق ہو تو اس کے لئے زیادہ اہمیت دینی ہوگی۔ منگھڑت خبروں اور بے سروپا واقعات کا شائع کرنا کارآمد نہ ہوگا کیونکہ اس سے اخبار کی غرض پوری ہونا ممکن نہیں۔ اخبار کو انگریزی میں نیوز پیپر کہتے ہیں یعنی خبری اُرکا اہم جزہے۔ نیوز انگریزی لفظ ہے اور مرکب ہے News سے، N سے مراد North شمال، E سے مراد East مشرق، W سے مراد West مغرب، S سے مراد South جنوب ہے یعنے چاروں سمت سے جو خبریں

آتی ہیں ان کے مجموعہ کا نام نیوز پیپر یا اخبار ہے۔

خبریں بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی سے وابستہ ہوں۔ روزانہ اخبار کو کم ازکم ایک صفحہ اور ہفتہ وار اخبار کو کم ازکم دو تین صفحے ملک کی خبروں کے لئے مخصوص کرنا چاہئے، اور ان خبروں کی ترتیب اس طرح ہونا چاہئے کہ مقامی حالات پہلے پھر ملک کے حالات اور آخر میں غیر ممالک کے واقعات درج ہوں۔ خبریں اہمیت کے لحاظ سے منتخب کرکے شائع کرنے سے قارئین اخبار کو فائدہ پہونچتا ہے۔

مختصر نویسی ہر دیسی زبان میں مختصر نویسی کا رواج ہونا چاہئے۔ آج کل بڑے بڑے مقامات میں جلسے اور تقریریں ہوا کرتی ہیں۔ ان تقریروں کو شائع کیا جاتا ہے، لیکن مقرر کے لہجہ سے پیدا شدہ جذبات مفقود ہوجاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ فن مختصر نویسی کو ترقی دیجائے۔

اخبار نویس کو چاہئے کہ " وہ اپنے طرز تحریر کو سادہ اور معقول رکھے۔ اس میں جامعیت اختیار کرے۔ اور جو کچھ لکھے بہت سوچ سمجھ کر لکھے "۔

اخبار نویسوں کے طبقہ میں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو یہ دعوے کرے کہ جو خود کر رہا ہے ٹھیک ہے اور جو خود جانتا ہے وہ صحیح ہے اس کے علم میں کوئی نقص نہیں ہے۔ انسان آخر انسان ہے ہماری آنکھیں ایسی نہیں کہ فوق الفطرت نظام کو دیکھ سکیں۔ آج جو چیز ہم کو صحیح معلوم ہوتی ہے وہ ممکن ہے کہ کل غلط ثابت ہو۔ دنیوی حالات کے متعلق یہ کہنا کہ ہمارا علم صحیح ہے، غلط ہے۔ ہماری قوت محدود ہے۔ ہمارا علم محدود ہے۔ ہماری نظر بھی محدود ہے۔ ممکن ہے کہ ہم سے غلطیاں ہوں تاہم ہم میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ دنیا کے حالات کے متعلق اپنی رائے اس طرح ظاہر کریں کہ دوسروں کو ناگوار نہ ہو، اور یہی کامیاب اخبار نویسی کی دلیل ہے۔

اخبار پبلک کا وکیل ہے جمہوری حکومت میں اخبار کو پبلک کا باطن کہا جاسکتا ہے۔ باطن کا سب سے اہم فعل یہ ہے کہ غور وخوض کرے۔ بادشاہ کے لئے جس طرح وزیر کی ضرورت ہے، اسی طرح پبلک کے حق میں بطور وکیل کے اخبار کی حاجت ہے، یعنے وہ حکومت کے معاملات پر تفصیل سے بحث کرے۔ اور ذمہ داریوں کو سمجھے۔ زمانہ قدیم میں وزرار بادشاہ کے ساتھ امور سلطنت پر بحث کرکے اپنا مشورہ دیتے تھے۔ اور تصفیہ بادشاہ پر چھوڑ دیتے تھے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں اخبار کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ عوام میں رائے صائبہ کے اظہار کی قابلیت پیدا کردے۔ لیکن ہمارے اخبار نویس اپنی رائے کو قطعی، بے عیب اور صحیح تصور کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ ممکن ہے دنیا میں ایسے قابل لوگ اور ہوں جن کو وہ نہیں جانتے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسروں کی رائے صداقت پر مبنی ہو۔ جب تک معاملہ کے تمام پہلو اخبار نویس کی نظر میں نہ ہوں اسوقت تک اس پر رائے دینے میں جلدی اور جرات نہ کرنی چاہئے۔

برٹش انڈیا کے عہدہ داران اخبارات کی رائے پر اعتراض کرتے ہیں اُن کا کہنا یہ ہو کہ جب وہ مسائل کے ہر پہلو پر غور کرتے ہیں، انصاف اور ناانصافی میں امتیاز کرتے ہیں تو اس کے باوجود عوام کے نمایندے کیوں صدائے احتجاج بلند کرتے اور اخبارات کیوں چیخ پکار کرتے ہیں۔

آزادی خیال

اگر عوام کو مناسب حد تک آزادی خیال اور غور و فکر کا موقع نہ دیا جائے تو ڈر ہے کہ ان کا جوہر قابل زائل ہو جائے۔ اخباروں کو لازم نہیں ہے کہ اپنی ہی رائے پر مصر رہیں اور عوام کو اپنی عقل کے استعمال کا موقع نہ دیں۔ ماں کی یہ خواہش رہتی ہے کہ بچہ دودھ کو ہضم کرے۔ وہ نوالہ کو خود اپنے منھ میں چبا کر اپنے بچہ کے منھ میں نہیں ڈالتی، بلکہ اس کے منھ میں نوالہ رکھ دیتی ہے اور اسے چبا لینے اور ہضم کر لینے کا موقع دیتی ہے۔ اخبار نویس کو چاہئے کہ ملک کے واقعات، خبروں کی شکل میں پبلک تک پہونچاتا رہے۔ حالات کے متعلق افتتاحیہ مقالے لکھے اور ایسی تنقید کرے جو دلائل پر مبنی ہو مسائل حاضرہ کے محاسن و نقائص بتلائے۔ کسی غلط بیان پر قائم نہ رہے، نہ کسی امر پر ضد کرے۔ ملکی ضروریات کا اشارہ کرنا بلکہ عوام کو ان کے مطالبہ کا موقع دینا اخبار نویسی کا راز ہے۔ اخبار نویس کا منصب یہ نہیں کہ اصول کا تعین کرے بلکہ یہ ہے کہ اصول تک پہونچنے کا ذریعہ بتائے۔ اس لئے اخبار کے مباحثی اجزا میں پہلا جو اہم جز ایڈیٹوریل ہے اس میں جذبات سے کام نہ لے بلکہ سنجیدہ تبصرہ کرے۔

نکتہ چینی

فطرتاً ہم میں آزاد خیالی کا فقدان ہے۔ مقدس صحیفوں کی عقیدت، بزرگوں کی ارادت، بادشاہوں کی وفاداری عزیز و اقارب کی وابستگی، رسوم کی پابندی ہمارے ضمیر میں داخل ہے۔ اس لئے پبلک کو آزاد خیالی کی تعلیم دینا بازیچۂ اطفال نہیں۔ علاوہ بریں موجودہ زمانہ میں نئے نئے گروہ، نئے نئے خیال کے حامی پیدا ہو رہے ہیں۔ ایسے وقت میں اخبارات ہی کے ذریعہ سے پبلک میں بیداری پیدا ہو سکتی ہے۔ عوام کچھ بھی کہیں لیکن دلیل کے ساتھ کہیں۔ رائے عامہ ناجائز دباؤ سے متاثر نہ ہو، بلکہ غور و خوض پر مبنی ہو۔ اس لئے اخبار نویسوں کا فرض ہے کہ پبلک کو اس کا طریقہ بتلائیں۔ اخبار نویس کو ایسی نکتہ چینی نہ کرنی چاہئے جس سے نفرت پھیلے، کیونکہ ایسے اخبار کے ساتھ کوئی حکومت ضبط و خاموشی اختیار نہیں کر سکتی جو راعی اور رعایا کے درمیان منافرت کا بیج بوئے۔

یورپ اور امریکہ کی اخبار نویسی کا زبردست عیب

نکتہ چینی سے مراد نری خشک بحث نہیں ہے بلکہ اس سے غرض یہ ہے کہ خرابیوں کی باریکیاں تلاش کی جائیں یہ کہنا آسان ہے کہ "سچ کہو اور نیکی کرو"، لیکن حق اور نیکی کی تلاش محال ہے۔ وہ اکثر پوشیدہ رہتے ہیں۔ ان کو ڈھونڈنے کے لئے صرف ایک ہی روشنی ہے، وہ ہماری عقل کی روشنی ہے۔ بحث، تجسس، نقد و تبصرہ اس کی شعاعیں ہیں۔ انسانی کاروبار میں ایسا نہیں ہوتا کہ ایک طرف صداقت اور دوسری طرف کذب ہو۔ یا ایک جانب انصاف اور دوسری جانب ظلم بلکہ دنیا میں دونوں چیزیں ملی جلی ہیں۔ اسی آمیزش کو الگ کرنا اور صداقت کو

ڈھونڈنا تنقید کی اصلی غایت ہے - پبلک کا آزادی خیال سے آگاہ ہونا ضروری ہے - اس کی ذمہ داری اخبارات پر ہے - جمہوریہ حکومت سے یہ مراد نہیں ہے کہ اس حکومت کا کوئی دشمن نہیں - بیرونی دشمنوں کو ایک طرف رہنے دیجئے - اندرونی دشمنوں کی کیا کمی ہے - یہی دشمن پبلک میں باغیانہ خیالات پھیلاتے ہیں - سراسر مغالطے پیدا کرتے ہیں پیچیدہ مسائل میں پھنساتے ہیں - غصہ کی آگ کو بھڑکاتے ہیں اور جذبات میں تلاطم پیدا کردیتے ہیں ملک کے لئے پبلک کی حکومت کی ضرورت ہے نہ کہ اخبار نویسوں کی حکومت - اخبار ایک مقدس اور اہم چیز ہے لیکن اس سے بھی مقدس پبلک ہے - پبلک مفاد کا اخبار صرف ایک آلہ ہے - آلہ کا کام نہیں کہ ملک میں خود فراموشی پیدا کرے - اس قسم کی بداطواریاں امریکہ اور یورپ میں دیکھی جاتی ہیں -

اخبار کے افکار و مباحث کے ضمن میں دوسری اہم شئے مراسلت ہے - ہمارے ملک میں یہ طریقہ ابھی اس قدر ترقی پذیر نہیں ہوا ہے - اس حصہ میں ایسے مضامین شائع ہونے چاہئیں جو اخبار نویس کے خیال میں نہ آئے ہوں، اور جو پبلک کی تکالیف اور ضروریات اور دیگر معاشرتی مسائل پر رائے زنی کریں - انگلستان کے مشہور اخبارات کا یہ حصہ نہایت دلچسپ ہوتا ہے - رہبران قوم کی امداد کے بغیر اس کا تحریر میں لایا جانا ناممکن ہے - اس لئے اخبار نویسوں کا یہ فرض ہے کہ اکابر قوم کو لکھنے کی ترغیب دیں اور اُن سے اچھوتے مضامین حاصل کرنے کی کوشش کریں -

فرضی مضمون نگار جہاں تک ممکن ہو اخبارات میں مضمون نگاروں کو اپنا نام ظاہر کرنا چاہئے، کیونکہ ان کے مضامین ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں جس سے دوسروں کو بھی اس طرح لکھنے کا حوصلہ ہوتا ہے - بے نام مضامین کی وقعت کم ہوتی ہے - البتہ خاص خاص موقعوں پر اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ نام نہ لکھا جائے - بقول ایک نامور گمنام نویس کے نام نہ ظاہر کرنے کا طریقہ اس اصول پر مبنی ہے کہ صدہا باتیں دوسروں تک گمنام گوئی کے ذریعہ پہونچتی ہیں اور ان میں سے بعض اس قدر قیمتی اور ضروری اور برموقع ہوتی ہیں کہ ان کی وجہ سے بڑے بڑے اور پیچے واقعات پر روشنی پڑتی ہے -

حال میں اکثر نامہ نگاروں نے فرضی نام سے مذاقیہ مضامین کو اخبارات میں لکھنا شروع کیا ہے - مذاق ہر شخص کو مرغوب ہے - مذاق ایسا ہونا چاہئے جو ذوق پر گراں نہو - انگریز نامہ نگاروں میں یہ چیز فطری ہو گئی ہے - اس لئے ان کے مذاقیہ مضمون سے کسی کی عزت میں فرق نہیں آتا - لیکن ہمارے ہاں اس قسم کا مذاق مشکل سے ملتا ہے - اس معاملہ میں ہم کو بہت احتیاط کام میں لانی چاہئے - اخبار کو اولاً وقار کی ضرورت ہے جس کا مدار مضامین کی سنجیدگی اور صداقت پر ہے - متانت اور صداقت کے ساتھ اگر مذاق کیا جائے تو مضائقہ نہیں ورنہ صرف مذاق ہی مذاق بدمزاقی کی دلیل ہوگی -

تنقید کی غرض

حکومت کے اغراض و مقاصد پر غور کرنا اور ارباب نظم ونسق کی غلطیاں حکومت کو بتانا اخبار کا فرض ہے۔ لیکن اس میں اخبار کو اپنے حدود کے اندر رہنا ضروری ہے۔ ذاتی خصومت خودغرضی، جانبداری اگر یہ چیزیں اخبار کے مطمح نظر ہوں تو اس سے اخبار کا وقار باقی نہ رہیگا۔ اڈیٹر کے قلم سے جسقدر وزنی، مدلل اور برمحل الفاظ نکلیں، اسی قدر اس کے اخبار کا اثر دیرپا اور مستقل ہوگا۔ نکتہ چینی سے دوسروں کو صدمہ پہونچانا بہت آسان ہے، لیکن یہ دشوار ہے کہ نکتہ چینی سے اس کے گرفت میں آیا ہوا شخص اسکی صداقت سے انکار نہ کر سکے۔ ہماری تنقید کے شکار گو اس وقت قہر وغضب ظاہر کریں لیکن اگر بعد کو اس تنقید کی قدر، اور عزت کریں تو اس وقت نکتہ چینی کا مقصد پورا ہوگا۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہمارے مضامین میں سچائی اور غیر جانبداری ہو۔ نیز حکومت کی نسبت جو کچھ لکھا جائے اس میں ادب اور تعظیم کو نصب العین بنایا جائے۔ حکومت یا پبلک کی نکتہ چینی میں خیر خواہی اور سنجیدگی کو ہاتھ سے نہ دیا جائے۔

مضامین کا انتخاب

مضامین کے انتخاب میں اہم وغیر اہم کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ عام طور سے معمولی مسائل پر بار بار لکھنا مفید نہیں۔ انسانی جماعت کو لاکھ بے عیب بنانے کی کوشش کیجئے، پھر بھی اس کے اندر چند نقائص ضرور باقی رہ جائیں گے۔ لوگوں کی اصلاح کے خیال میں دوسرے اہم معاملات کو نظر انداز کرنے کا اندیشہ ہے۔ اخباروں کو یہ نہ چاہئے کہ خواہ مخواہ معمولی مسئلہ کو بار بار چھیڑیں اس معاملہ میں برطانیہ کے اخبار نویس خاص دلچسپی لے رہے ہیں اور غور کر رہے ہیں کہ اخباری دنیا سے اس مرض کو کس طرح رفع کیا جائے۔

محنت رائیگاں نہیں ہوتی

حکومت کے کاروبار کو جانچنا، ضروری اصلاحات کو ساتھ ساتھ پیش کرنا اخبار کا اہم فرض ہے، ہمارے اخبارات میں یہ جز ابھی متانت کو نہیں پہونچا ہے۔ مضامین میں اشتعال انگیز جذبات اور رنگین عبارت کے عوض صرف واقعات کو احتساب و تمثیلات سے واضح کرنا مفید ہے۔ مضمون نگار کو چاہئے کہ پہلے سرکاری اغراض و مقاصد کا غور سے مطالعہ کرلے اور اس کے بعد سرکاری کاروبار پر قلم اٹھائے۔

تعلیمی مضامین

قوم کی بڑی خدمت ہوگی اگر ملک کے علماء، سائنس داں اور ماہران فن ونیز مختلف پیشہ کے تجربہ کار افراد تعلیمی اغراض کے مدنظر اخبارات میں مضامین لکھتے رہیں۔ انگریزی اخبارات میں اکثر ایسے مضمون نظر آتے ہیں۔ جن لوگوں میں ادب وعلوم وفنون کا ذوق مفقود ہوتا ہے وہ سیاسی امور کو جاننے کے قابل نہیں ہوتے۔ ابتک ہمارے اخبارات پبلک کو خواب غفلت سے بیدار کرتے رہے۔ اب ضرورت ہے کہ پبلک میں معاملہ فہمی کی قابلیت بڑھائی جائے، ورنہ پبلک کی بیداری نتیجہ خیز نہ ہوگی۔

تجربہ کار لوگ نامہ نگاری اختیار کریں

کیا اچھا ہو اگر ہمارے ملک کے سرکاری عہدہ دار جو ملازمت سے فراغت حاصل کر کے وظیفہ حاصل کر رہے ہیں، قوم کو اپنے تجربہ سے مفید معلومات بہم پہونچائیں، مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ کام آسان نہیں کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی وظیفہ یاب آرام سے پاؤں پھیلائے بیٹھنے اور فراغت سے وقت گزارنے کے بجائے اس مشغلہ میں محنت کریگا۔ لیکن ہم کو چاہئے کہ ایسے لوگوں کے پاس پہونچکر نہایت ادب سے ان پر ظاہر کر دیں کہ ان کی اس قسم کی زندگی نقصان دہ ہے اور اس وقت ملک کے لئے ان کے خدمات درکار ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ لوگ ہماری درخواست قبول کر لیں گے اور اپنے تجربہ سے ہم کو فائدہ پہونچائیں گے۔ اس لئے ہمارے اخبار نویس اس جانب توجہ کریں اور ملک میں جو لوگ اچھے کام کرنے والے ہیں اُن کی قدر کریں۔

رہبرانِ قوم، مشہور وکلاء، مجلس بلدیہ کے ارکان، علماء و حکما، مختلف انجمنوں کے معتمدین کا مضمون نگاری کرنا بہت نفع بخش ہوتا ہے۔ ہمارے قائدین جس طرح بڑے بڑے جلسوں میں بارہا تقریریں کرتے ہیں اسی طرح کم از کم سال میں سات آٹھ مرتبہ مضامین لکھا کریں تو اس سے ان کا بھی فایدہ ہے، اخبار کا بھی اور عوام کا بھی۔ مغربی ممالک میں ایسے لوگ بکثرت مضمون لکھتے ہیں اور ملک و قوم کو فایدہ پہونچاتے ہیں۔

بسمارک کو اخبار نویسی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ گلاڈسٹن زبردست نامہ نگار تھا۔ ان کے علاوہ ٹمپل، ڈفٹ، میتور، لائل، کالون، گریفن، ہنٹر، ڈگلس، وغیرہ انگلستان کے ان مایہ ناز افراد سے ہیں جنھوں نے وظیفہ حسن خدمت لینے کے بعد اپنی تمام عمر نامہ نگاری میں بسر کی اور حب وطن کا ثبوت دیا۔

اخبار کی قوت

یہی نہیں کہ اخبارات عوام کے لئے کچھ کر سکتے ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کو کچھ کرنے سے روک سکتے ہیں ان کو کچھ کرنے پر اُبھار سکتے ہیں۔ اکثر بے ضابطگیاں اور ناانصافیاں مسدود کر سکتے ہیں بعض ملزمین ایک طرف عدالت اور پولیس کی تفتیش سے اور دوسری طرف بدنامی کے ڈر سے بدکاری سے باز آتے ہیں۔ اس طرح اخباری اشاعت کے ڈر سے اکثر عہدہ دار اور زبردست اشخاص اپنے ناروا افعال سے رک جاتے ہیں۔ اس لئے سب سے بڑا فرض اخبار کا یہ ہے کہ جن کی برائیوں سے ملک اور سوسائٹی کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو، ان پر آزادانہ نکتہ چینی کرے۔

اخبار پبلک کی ملک ہے

ملک کے ہر فرد کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ اخبار اپنا ہے۔ اور اس کی خدمت اخبار کے واسطے لازم ہے۔ اس کا نیک و بد اپنا نیک و بد ہے۔ اس کا نفع و نقصان اپنا سود و زیاں ہے۔ اس خیال کے تحت میں اس کو استطاعت ہو تو، اخبار کا خریدار بننا، اخبار کی اشاعت بڑھانا اور اگر استعداد ہو تو وقتاً فوقتاً اس میں اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہئے۔ اس کے بغیر اخباری حالت

درست نہیں ہو سکتی، اور نہ قوم کی خدمت خاطر خواہ انجام پا سکتی ہے۔

علمی مسائل اور قومی مباحث

ہمارے اخبارات میں مضامین کا تنوع مفقود ہے۔ عام طور سے تاربرقیاں یا سیاسی معاملات درج ہوتے ہیں۔ ادب و تاریخ کے مقالے بہت کم نظر آتے ہیں۔ علمی مضامین، معاشی مسائل اور مغربی تہذیب کی بہترین خصوصیات پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ معاشی وسائل پر التفات نہیں کیا جاتا اور معاشرتی مسائل بہت کم معرض تحریر میں آتے ہیں۔ ہمارے مذہبی تعصبات اور مذہبی ادارے تمام ملک میں فساد کا بیج بو رہے ہیں۔ کیا اخبارات کا یہ کام نہیں ہے کہ عوام کی توجہ اس جانب منعطف کرکے ان میں پاکیزہ خیالات پیدا کریں، اور اس خصوص میں انگریزی اخبارات کی تقلید کریں۔ مختلف موضوعات پر خیال آرائی کرکے ہمارے اخبارات پبلک کے لئے نہایت دلچسپ اور منفعت بخش ہو سکتے ہیں۔ ملایانہ اور طالبعلمانہ بحث میں پڑنے کی حاجت نہیں اور نہ مذہبی مباحث میں دخل دینے کی ضرورت۔

نئے نئے اور اصطلاحی الفاظ کا وضع کرنا

یہ زمانہ ایجادات و اختراعات کا ہے جن کی تشریح کے لئے خاص خاص الفاظ ہماری زبان میں نہیں پائے جاتے۔ اسلئے ضرورت ہے کہ نئے نئے الفاظ وضع کئے جائیں۔ نئی نئی اصطلاحات بنائی جائیں۔ اخبارات میں جو لفظ استعمال کئے جاتے ہیں، رفتہ رفتہ زباں زد ہو جاتے ہیں، اس لئے ہمارے اخبارات اس خصوص میں نہایت احتیاط سے قدم اُٹھائیں۔ یہ الفاظ ایسے ہوں کہ مفہوم بھی اُن سے ادا ہو، اور ان کے رواج میں دشواری بھی نہ ہو، تمام اخبارات کو مفہوم کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرنا چاہیے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ عمل کی یکسانی کے واسطے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں دارالترجمہ نے جو نئے الفاظ اور اصطلاحات وضع کئے ہیں، اُن سے ہندوستان کے تمام اُردو اخبارات کو روشناس کرایا جائے تاکہ اخبارات کے ذریعہ سے وہ الفاظ و اصطلاحات متداول ہو جائیں۔ دوسرا ضروری امر یہ ہے کہ اسلوب بیان سادہ اور سریع الفہم ہو۔ عوام کی ذہنیت اس قسم کی نہیں کہ اخبار پڑھتے وقت مطالب سمجھنے کے لئے وقت صرف کریں اور الفاظ کے معنی کے لئے لغات دیکھنے بیٹھیں۔

اشتہارات

تجارتی اشتہارات کے متعلق میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا، کیونکہ ہمارے اخبارات میں اشتہارات کا حصہ کچھ زیادہ اہم نہیں۔ جب تک اخبارات کی اشاعت زیادہ تعداد میں نہ ہو، اس وقت تک اشتہارات زیادہ مہیا نہیں ہو سکتے۔ و نیز اشتہارات شائع ہوئے بغیر اخبارات کو فایدہ نہیں ہو سکتا۔ اور بغیر فایدے کے اخبار کی توسیع اشاعت ممکن نہیں۔ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اس وقت اشتہارات بے لطفی و بدمزگی پیدا کرنے والی تصاویر و الفاظ سے پُر ہوتے ہیں اور

ناپاک امراض سے متعلق ہوتے ہیں۔ جو عورتوں اور بچوں کے دیکھنے کے قابل نہیں ہوتے۔ بعض اشتہارات ناکمل اور ایسے مبہم الفاظ میں ہوتے ہیں کہ قارئین کے دلوں میں ان کے پڑھنے سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ ایسے اشتہارات کو شائع نہ کرنے سے گو مالی نقصان ہوتا ہے، لیکن نقصان کو گوارا کرنا اخبارات کے لئے مشکل نہیں ہے۔ اہلِ مغرب نے اشتہار کو فن بنالیا ہے، اور اشتہار اس حسن کے ساتھ شائع کرتے ہیں کہ پبلک کو خواہ مخواہ اس شئے کے خریدنے کی ترغیب ہوتی ہے جس کی نسبت اشتہار دیا گیا ہے۔ مغرب میں اشتہار کو جس قدر عروج حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈیلی میل کے پہلے صفحہ پر اشتہارات کی اُجرت ایک دفعہ کے واسطے ... اگنی ہے۔

حکومت کے مراعات

حکومت اخبارات کو جو رعایتیں عطا کر سکتی ہے اس سے بحث کرنے کی اسوقت چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارے ملک کے گاؤں گاؤں میں ٹپہ کی سہولتیں پیدا کی جانی چاہیئے۔ اخبار نویسوں کو آمدرفت کی سہولت کے مدنظر ریلوے کی رعایتیں بھی ہونا قرین انصاف ہے کیا خوب ہو اگر تجارتی ادارے اور مرکزی حکومتیں اپنے رپورٹوں کے ترجمے کرا کے اخبار نویسوں کو وقت پر بہم پہونچانے کا انتظام کریں۔ ونیز دیگر نیم سرکاری ادارے اپنی سالانہ رپورٹیں اخبار نویسوں کو بھیجا کریں۔

اخبار نویسی کا شوق

اکثر نوجوانوں کو اخبارات جاری کرنے کا شوق ہے۔ نوجوانوں کو یہ خبط رہتا ہے کہ حکومت کی ناانصافی کا قلع قمع کر دیں گے، عہدہ داروں کی قوت کو توڑ دیں گے۔ بڑے بڑے تقریر کرنے والوں کی اپنے قلم کے زور سے سرکوبی کریں گے۔ لیکن بیچارے یہ نہیں جانتے کہ ایسے خیالات وہم ہی وہم ہیں۔ اگر کوئی نوجوان یہ پیشہ اختیار کرنے کے لئے میری رائے طلب کرے تو میں اس کو منع کردونگا کیونکہ یہ پیشہ بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے ظاہری و باطنی دولت درکار ہے۔ اور اس دولت کے بغیر اخبار نویسی اختیار کرنا عقلمندی کی دلیل نہیں۔

اخبار نویسی کی ضروریات

یہ پیشہ ایک حیثیت سے تجارتی ہے اور دوسری حیثیت سے ایک مقدس فرض اس قسم کی دونوں سہولتیں ایک شخص میں شاید ہی جمع ہوتی ہوں۔ مغربی ممالک میں اخبار کے لئے ایک شخص سرمایہ مہیا کرتا ہے، دوسرا مضامین لکھتا ہے۔ تجارتی انتظام الگ ہوتا ہے اور ضروری مضامین کا اہتمام الگ۔ اس لئے وہاں اخباروں کی ترقی کے لئے گنجایش ہے۔ وہاں سرمایہ مشترکہ کی کمپنیاں قائم ہیں، جو بڑی سہولتوں کا باعث ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں سرمایہ مشترکہ کا قحط ہے۔ باہمی اتحاد و اعتماد کے ساتھ سرمایہ دار کام کرنے کی جانب جب تک آمادہ نہ ہوں، اسوقت تک مشترک سرمایہ کی

کمپنیاں یہاں قائم نہیں ہو سکتیں۔

یہ کہنا سراسر لغو ہے کہ کم سرمایہ سے بھی اخبارات بڑے پیمانہ پر چلائے جا سکتے ہیں۔ تجارت کی مانند اخباروں کو بھی چلانا سرمایہ کی کمی و بیشی پر منحصر ہے۔ یہ کہیں نہیں دیکھا گیا کہ کم سرمایہ سے کوئی اخبار مشہور و مفید ثابت ہوا ہو۔ ہمارے ملک میں متعدد اخبارات ہیں لیکن ان کی اشاعت محدود ہے۔ بہتر ہے کہ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے دس پانچ اخبارات کو چلانے کے بجائے بڑے پیمانہ پر ایک ہی اخبار مصور اور ضخیم نکالا جائے۔

ایک دو مفید مشورے

اخباری پیشہ میں محنت کرنے کی خواہش رکھنے والوں کو اس سے روکنا بھی مناسب نہیں۔ وکیل، مدرس و حکیم کے مانند اخبار نویس کو بھی مختلف علوم کا مطالعہ اور اپنے معلومات بڑھانا ضروری ہے۔ صرف خواہشِ ادارت یا لکھنے پڑھنے کی مہارت کافی نہیں۔ علم المعیشت خصوصیت کے ساتھ جاننا لازم ہے، کیونکہ دنیا میں اس کا رواج دن بدن بڑھ رہا ہے۔ نقل و حمل کے ذرائع وسیع ہو جانے سے مختلف ممالک ایک ہو گئے ہیں۔ تجارت و مشنری کی ترقی سے مختلف ممالک کے اقتصادی حالات ایک دوسرے سے وابستہ ہو کر روز بروز نئے نئے اور بہت ہی پیچیدہ مسایل پیدا کر رہے ہیں۔ اس قسم کے مسائل کو سمجھنے کے لئے وسیع مطالعہ ناگزیر ہے۔ اخبار نویس کو قدیم اور جدید کتب کا مطالعہ جاری رکھنا چاہئے، اور اسکے ساتھ ساتھ اہل الرائے اصحاب سے مل کر حالات حاضرہ پر بحث کرنا چاہئے۔ اپنی رائے سے جو اشخاص اتفاق نہ کریں ان کی زیادہ قدر کرنی چاہئے، اور ان سے زیادہ مباحثہ کرنا چاہئے۔ بحث اسی وقت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے جبکہ وہ بے لوث اور منصفانہ ہو، اور جبکہ عقل سلیم کے قریں ہو۔ اخبار نویسوں کو چاہئے کہ مسائل کے تمام پہلوؤں کو جانچ کر اہم و غیر اہم میں، ممکن اور غیر ممکن میں تمیز کریں اور عادلانہ تصفیہ کرنے کی کوشش کریں۔

ہر شخص چاہتا ہے کہ ملک کی ترقی سے عوام کو فائدہ پہونچے۔ اس سے مدارس کے طلبہ تک آگاہ ہیں لیکن ملک کے کیا معنی ہیں؟ ملک کی ترقی کیوں ضروری ہے؟ کس طرح یہ ممکن ہے اور کس حال میں ناممکن ہے؟۔ عوام کے فوائد کس امر میں مضمر ہیں، اور وہ فواید کس قسم کے ہیں؟ کیا ترقی ہمارے ملک تک محدود رہے یا دوسرے ممالک کی ترقی کے ساتھ وابستہ ہو؟ ایسے صدہا سوالات ہیں جن کا جواب دینے یا نتیجہ نکالنے کے لئے اخبار نویس کو ایک آزاد و فلسفیانہ خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس قسم کے تصفیہ کا تصور اپنے دل میں کرنے کے لئے بھی زندگی کے مختلف شعبوں کی کماحقہ واقفیت لازمی ہے۔ سلطنتوں کی بقا و فنا اور قوموں کا زوال و عروج اور ان کے وجوہ کو انسانی تجربہ کی کسوٹی پر کسنا ضروری ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اخبار نویس بھی مثل دوسرے انسانوں کی دنیا کے عام اصول کا پابند ہے۔ ایک مہذب شخص میں جو نیک خصلتیں درکار ہیں، وہی اخبار نویس میں بھی

مطلوب ہیں۔ اس کے اندر صداقت۔ محنت۔ غیر جانبداری، مظلومین کی امداد اور مستحقین کی تائید کا جذبہ پایا جانا ازبس ضروری ہے۔

محنت کی زندگی

اخبار نویس کو خواہ وہ فرض کے طور پر اس کام کو اختیار کرے یا پیشے کی حیثیت سے ہر حالت میں ملک کا بہی خواہ اور بنی نوع انسان کا شیفتہ ہونا لازمی ہے اس کے لئے اس کو سخت محنت و مشقت برداشت کرنی چاہئے۔ اخبار نویس کو ایک سپاہی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ پولیس کا جوان شب بیداری کرتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ گاؤں یا شہر کے باشندے بلا خوف وخطر سو جائیں سپاہی میدان میں اس لئے لڑتا ہے کہ ملک پر غیروں کا قبضہ نہ ہونے پائے۔ اسی طرح اخبار نویس کو ہر وقت فکر مند رہنا چاہئے کہ ابنائے ملک خوشحال زندگی بسر کریں اور ملک کے حقوق غصب نہ ہوں اور امن و اطمینان کے ساتھ رہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اخبار نویس کی زندگی کس قدر مشکل ہے۔ ہمارے ملک میں اس پیشہ کے لئے ضروری سہولتیں موجود نہیں ہیں۔ کافی سرمایہ میسر نہیں ہوتا، کتابیں فراہم نہیں ہوتیں۔ خاطر خواہ پبلک کی سرپرستی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے کسی نوجوان کو اس پیشے کے لئے کمر نہ باندھنا چاہئے، تاوقتیکہ وہ مصائب جھیلنے پر تیار نہ ہو جائے۔ اچھا صحیفہ نگار ملک کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ہے، لیکن جو شخص صحیح راستہ سے بھٹکا ہوا ہوگا وہ ملک کی بدنامی کا باعث ہوگا۔

اخبار نویس کو کسی فرد یا جماعت کے زیر اثر نہ رہنا چاہئے

امریکہ اور یورپ میں بیشتر اخبارات تجارت کی غرض سے جاری ہوتے ہیں۔ وہاں کے تجار، امراء اور دیگر سرمایہ دار سینیٹ کے اراکین کو ہموار کر کے سیاسی قوت حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ سے دولت و عزت پانے کی خاطر اخبارات کا سہارا لیتے ہیں۔ اپنے اغراض کی تکمیل کے لئے اخباروں کو سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ اشتہارات وغیرہ کے ذریعہ مالی امداد بہم پہونچاتے ہیں، اخبار کے مالک یا لکھنے والے کو اپنا بنا لیتے ہیں۔ اس سے لکھنے والے کی آزادی سلب ہو جاتی ہے اور اس کے پیشہ پر دھبہ لگ جاتا ہے۔ ہمارے اخبارات ایسے افراد کے دام تزویر میں نہ آئیں تو اچھا ہے۔ سرمایہ دار اور مشہور افراد ملک بھی اخبار کی آزادی میں رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں، اس لئے اخبار نویس کو ہمیشہ آزاد خیال ہونا چاہئے۔

ہندو مسلم میں اتحاد

ہندوستان میں اکثر ہندو مسلم فساد برپا ہوتے رہتے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس فساد کے بانی دیسی زبان کے اخبارات ہیں۔ اخبار نویس کے جذبات اخبار کے ذریعہ منظر عام پر آتے ہیں۔ اخبار پڑھنے والوں میں بھی وہی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہمارے اخبار نویس اس قسم کے جذبات سے محترز رہیں۔ عوام میں نفاق پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہ کریں۔ ہماری

صحافت کا مسلک عوام کا اتحاد ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کو پیدا کرنے یا مٹانے کی قوت اخبار میں موجود ہوتی ہے۔

صحافت میں مغربی تقلید

اصل میں اخبار نویسی کا پیشہ ہمارے ملک کے لئے نیا ہے۔ انگلستان سے یہاں آیا ہے۔ وہاں کے اخبارات ٹائمز، ڈیلی میل، منچسٹر گارڈین۔ مارننگ پوسٹ وغیرہ کا انتظام، اشاعت کی پابندی، مضامین کا تنوع، زبان کی فصاحت، طباعت کی خوبصورتی، ان تمام اُمور میں ہم کو ان کی تقلید ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اخبار کو چلانا معمولی کام نہیں۔ اخبار کی کامیابی کے لئے زبردست مطالعہ، کافی سرمایہ اور ملک کی خیرخواہی لازمی ہے۔ گو ہمارے ملک میں اکثر یہ تینوں اجزاء ایک جگہ جمع نہیں ہوتے، تاہم ان کی تکمیل کے لئے کافی کوشش کی گنجایش ہے۔ اس جانب عوام کی بیداری اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ عالموں کی امداد درکار ہے۔ ہمارے ملک کے سرمایہ دار فیاض ہوتے ہیں۔ مدرسوں، مسجدوں، مندروں، دھرم سالوں کی تعمیر و ترمیم کے کار خیر میں کافی دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر ان کا رجحان اخبار نویسوں کی حالت کی طرف ہو جائے تو یہاں کی صحافت بھی کافی ترقی کر سکتی ہے۔ مغربی ممالک میں ہر محنت کا معقول معاوضہ ملتا ہے۔ ملکی خادم اور پارلیمنٹ کے ارکان یکساں محنتانہ حاصل کرتے ہیں۔ اخبار نویس کو بھی اسی طرح صلہ ملتا ہے۔ اخبار نویس اپنے قلم کے ذریعہ سے روزی حاصل کرتا ہے۔ سابق وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ اخبار نویسی سے سالانہ لاکھوں روپیہ پیدا کرتے رہے۔ وزیر اعظم میکڈانلڈ کو بھی اسی طرح کثیر آمدنی ہوتی رہی۔ کاش ہمارے اخبارات بھی ایسے ہوتے کہ معقول معاوضے دیکر مشہور اہل قلم حضرات سے مضامین لکھواتے۔ اس خصوص میں بمبئی کے مشہور اخبار نویس مالاباری کی تحریر پڑھنے اور غور کرنے کے لایق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میری ادارت میں انڈین اسپکٹیٹر نکلتا رہا مگر اس میں مجھے ہمیشہ خسارہ رہا۔ نقصانِ صحت اور تضیع وقت کے علاوہ جس قدر مالی گھاٹا مجھے اُٹھانا پڑا ہے۔ اس کی یاد جب کبھی دل میں تازہ ہوتی ہے تو میری پریشانی خاطر بڑھ جاتی ہے۔ اخبار کی حالت بیمار اور کمزور بچے کی سی تھی۔ اس کے نامہ نگاروں میں اکثر بلا معاوضہ کام کرنے والے اور کمتر معاوضہ لینے والے تھے۔ انگریز نامہ نگاروں کو ۸ ر فی کالم اُجرت دیجاتی تھی۔ ایک غریب کرنل نے فوجی اصلاح پر متعدد آرٹیکل لکھے۔ جب میں نے ۱۲ کالم کے مضمون کے لئے چھ روپیہ بطور نذرانہ بھیجے اور یہ لکھا کہ اس سے آپکے سگریٹ کے ڈبے کا خرچ نکل آئیگا۔ تو اس نے مجھے جواب میں لکھا کہ "ہاں اس سے میری ننھی سی بے ماں کی بچی کا چند روز کے لئے دودھ روٹی کا خرچ چل جائیگا" اس سے میرے دل کو اس قدر صدمہ پہونچا کہ میں نے فوراً اپنی دو چاندی کی گھڑیاں جو شادی کے پہلے کی میرے پاس موجود تھیں فروخت کرکے انکی قیمت اپنے غریب پرانے نامہ نگار کے پاس بھیجدی۔ اور ایک خط سر اسٹوارٹ کمانڈر انچیف کو اس مطلب کا لکھا کہ وہ کرنل موصوف کو کچھ مالی امداد دلائیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرنل موصوف کی لڑکی کو تعلیم کے واسطے بھیجدیا گیا"۔

کاش مالاباری کی سی ہمدردی سب اخبار نویسوں میں پیدا ہو جائے۔

عبدالرزاق (حیدر آباد)

۲۴ اگست ۱۵۷۲ء

یعنی

تاریخ مذہب کا وہ تاریک دن جس کی نظیر چنگیز و ہلاکو بھی پیش نہ کر سکے

اگست کی چوبیس تاریخ ہے اور مطلع سخت غبار آلود۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کے ٹکڑے آہستہ آہستہ جمع ہو رہے ہیں، اور تاریکی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ دوپہر کے بعد آفتاب نے پھر اپنی صورت نہیں دکھائی، شام ہوتی ہے اور چاند طلوع ہوتا ہے لیکن حد درجہ سوگوار و غمگین، تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی بادلوں میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے اور تارے بھی زمین والوں کی طرف سے اپنا منھ موڑ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ ہوا میں تیزی شروع ہوتی ہے اور بڑھتے بڑھتے اس میں ایک کراہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ زمین کانپنے لگتی ہے، آسمان تھرا اٹھتا ہے اور کائنات کی فضا صرف ان چیخوں سے معمور نظر آتی ہے جو قتلگاہ سان بارتلومیو سے بلند ہوئی تھیں۔

مسلسل ۳۶۳ سال سے اگست کی یہ تاریخ ہر سال یہی منظر پیش کر رہی ہے اور قیامت تک پیش کرتی رہیگی۔ آپ شاید محسوس نہ کرتے ہوں گے، لیکن آیئے مختصراً اس داستان کو سن لیجئے، ممکن ہے کہ اس کے بعد میری طرح اس تاریخ کا یہ سوگوار منظر آپ کے دل میں بھی ہمیشہ کے لئے منقوش ہو جائے۔

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب یوروپ میں پروٹسٹنٹ مذہب آہستہ آہستہ ترقی پا رہا ہے اور کیتھولک مذہب کی طرف سے لوگ متنفر ہو رہے ہیں۔ یعنی یہ اسوقت کا ذکر ہے جب مذہب کی قدامت پرستی، عقلیت پسندی اختیار کرتی جاتی تھی۔ یوں تو یوروپ کے تمام ممالک میں اس جدید مسلک کی اشاعت ہو رہی تھی لیکن فرانس کی سرزمین اس کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوئی اور وہاں اس نے بہت جلد کافی جماعت پیدا کر لی تھی۔ تاہم چونکہ بعض امراء اب تک اس قدیم کیتھولک مذہب پر قائم تھے اس لئے فضا حد درجہ مکدر تھی اور لوگوں کے دل ایک دوسرے کے

خلاف حسد و کینہ سے لبریز نظر آتے تھے۔

شاہ فرانس ہنری ثانی کا انتقال ہو چکا ہے اور اپنے پیچھے اپنی بیوہ ملکہ کاترین کو چھوڑ گیا ہے اور اپنے بیٹے شارل کو۔ کاترین حد درجہ خود سر، مغرور و سنگدل عورت ہے جس نے اپنے چاروں طرف ملک کے قوی نوجوانوں کو جمع کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور اس کو جس طرف چاہتی ہے حرکت دیتی ہے۔ ہر چند ہنری کے بعد اس کا بیٹا شارل ہی تخت نشین ہوا تھا لیکن کاترین نے اس کو اس درجہ لہو لعب میں ڈالدیا تھا کہ اسے مطلق خبر نہ تھی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور خود ہی جو چاہتی تھی کرتی تھی۔

یہ وہ وقت تھا جو پروٹسٹنٹ مذہب وہاں غیر معمولی ترقی کر رہا تھا اور بڑے بڑے امراء و نبلاء اس کو اختیار کر چکے تھے تاہم چونکہ کیتھولک مذہب کے پیرو بھی کم نہ تھے اور بعض امراء ہنوز اس قدیم مسلک پر قایم تھے اس لئے ایک عجیب قسم کی خوفناک فضا ملک میں پیدا ہو گئی تھی اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس تصادم کا نتیجہ کیا ہوگا۔

کیتھولک مذہب کا سب سے بڑا حامی ڈیوک دی جیز تھا جو ملکہ کے نہایت مقرب حاشیہ نشینوں میں سے تھا اور کسی وقت اس سے علحدہ نہ ہوتا تھا۔ اول تو ملکہ خود کیتھولک مذہب رکھتی تھی، دوسرے دی جیز کی معیت، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پروٹسٹنٹ جماعت کی سخت مخالف ہو گئی اور ایسی آتش انتقام اس کے دل میں بھڑک اٹھی کہ وہ ہر وقت بے چین رہنے لگی۔ پھر چونکہ پروٹسٹنٹ امراء کی بھی جماعت کافی تھی اور اس میں کولینی اور دی کونڈا ایسے صاحب اقتدار امرا بھی شامل تھے اس لئے وہ کھلم کھلا مخالفت بھی نہ کر سکتی تھی اور دونوں جماعتوں کے ساتھ بظاہر یکساں سلوک مناسب خیال کرتی تھی — لیکن حقیقتاً وہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی اور ہر وقت اسی فکر میں لگی رہتی تھی کہ پروٹسٹنٹ کافروں سے کیونکر ملک کو پاک کرے۔

اسی دوران میں ہنری دی نافار نے جو پروٹسٹنٹ جماعت کا سب سے بڑا سردار تھا ملکہ کاترین کی بیٹی کے لئے پیغام بھیجا اور اس نے پسند کر کے ۱۸ اگست ۱۵۷۲ء تاریخ عقد مقرر کر دی۔

کاترین چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی کی یہ شادی اس اہتمام سے ہو کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہ ملے اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ ان واقعات کا اعادہ کر ہی نہیں سکتی جو اس شادی کے پردے میں ظاہر ہوئے۔ محافل نشاط کے انتظامات ہو رہے تھے، دعوتوں اور تفریحوں کے پروگرام طیار ہو رہے تھے اور در پردہ وہ سب کچھ بھی ہو رہا تھا، جس نے اگست کی ۲۴ تاریخ کو ابدالآباد کے لئے غیر فانی بنا دیا۔

کاترین نے اپنے تمام مقرب امراء، اور ارکان حرب کو پوشیدہ طور پر طلب کیا اور پروٹسٹنٹ جماعت سے انتقام لینے کی اسکیم پیش کی، جس کو سنکر سب کے دل کانپ گئے اور اس کے بیٹے شارل نے تو صاف انکار کر دیا لیکن کاترین

کی چالیں ایسی نہ تھیں کہ شارل کا انکار یا امرار کا پس وپیش قائم رہتا۔ آخر کار سب کو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور نکاح کے بعد تیسری رات یعنی اگست کی ۲۴ تاریخ اس کام کے لئے تجویز کی گئی۔

۲۳ اگست کو کاترین کے ساتھیوں نے کام شروع کر دیا یعنی غروب آفتاب سے قبل شہر کے ان تمام مکانات پر جن میں پروٹسٹنٹ رہتے تھے مخصوص نشانات بنادئے تاکہ کیتھولک جماعت کے مکانات سے وہ نمایاں طور پر الگ پہچان لئے جائیں۔

---

۲۴ اگست کی رات ہے اور پیرس بقعۂ نور ہو رہا ہے تمام پروٹسٹنٹ شرفاء و امرار شاہی دعوت میں شریک ہیں۔ اور ہر چہار طرف ہنگامۂ رقص و سرود برپا ہے۔

دفعتاً ملکہ کاترین کوئی عذر کرکے چلی جاتی ہے اور اندر کے ہال میں خفیہ طور پر اپنے ساتھیوں کو طلب کرکے پوچھتی ہے کہ "کیا تم سب طیار ہو" اس کے بعد وہ ڈیوک دی جینر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ "میں چند منٹ کے بعد پیرس کی گلیوں کی سیر کرنے کے لئے اپنے قصر سے باہر نکلوں گی اور میں چاہتی ہوں کہ میری یہ چہل قدمی ایسی جوئے خوں میں ہو جہاں میں کم از کم گھٹنے تک تو غرق ہو جاؤں"

یہ سنکر سب نے سر اطاعت خم کر دیا اور وہ یہ کہکر کہ "ہاں اب وقت آگیا ہے طیار ہو جاؤ" مسکراتی ہوئی پھر اس محفل طرب میں آگئی جہاں سے وہ گئی تھی۔

نصف شب ہو چکی ہے اور بزم رقص و سرود انتہائی نقطۂ تکمیل تک پہونچ گئی ہے کہ دفعتاً گرجاؤں سے ناقوس کی آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ علامت تھی اس بات کی کہ خدا اور مذہب کے نام پر اب خونریزی شروع کر دینا چاہئے۔ یہ آوازیں ہنوز فضا میں گونجتی ہوتی ہیں کہ قتل عام شروع ہو جاتا ہے۔ بزم شادی میں شریک ہونے والے تمام پروٹسٹنٹ امراد دفعتاً محصور کر لئے جاتے ہیں اور جو محفل اس سے پہلے صرف نغمہ و رقص اور ہنگامۂ نوشانوش کے لئے وقف تھی، اب وہاں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی، سر کٹ کٹ کر فرش پر گر رہے تھے، گردنوں سے خون کے فوارے جاری تھے، لاشے ہر چہار طرف تڑپ رہے تھے اور ہر جام بلوریں بجائے شراب کے اب لہو سے لبریز نظر آتا تھا۔ ٹھیک اسی ساعت میں جب قصر شاہی کے اندر یہ خونی کھیل کھیلا جا رہا تھا، شہر کے ہر گوشہ سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور کیتھولک جماعت پروٹسٹنٹ آبادی کے قتل عام میں مصروف تھی۔ نہ بچہ کی تمیز تھی نہ عورت کی، نہ بیمار پر رحم تھا نہ ضعیف پر۔ مذہب کا قول آشام دیوتا بپھرا ہوا تھا، اور انسانی جان کی قربانیوں پر قربانیاں طلب کر رہا تھا، وہ پیاسا تھا، خوں کا پیاسا تھا اور کسی طرح اس کی پیاس

نہ بجھتی تھی، معصوم بچے ماؤں کی گود سے چھین چھین کر آگ میں ڈالے جا رہے تھے اور اُن کے نرم نرم گوشت کے جلنے سے جو بو پھیل رہی تھی اس کو سونگھ سونگھ کر یہ دیوتا خوش ہو رہا تھا، حسین عورتوں کو برہنہ کر کر کے ان کا جسم نیزوں سے چھلنی کیا جاتا تھا اور اُن کی چیخ سن سن کر یہ خونخوار دیوتا ناچ رہا تھا۔

یہی وقت تھا اور یہی اس کا خونیں منظر کہ کاترین، اپنے مرکب شاہانہ کے ساتھ مسکراتی ہوئی قصر سے باہر نکلی تاکہ وہ لاشوں کو تڑپتے دیکھے اور خوش ہو، مکانوں کو جلتے ہوئے دیکھے اور مسرور ہو۔ وہ خراماں خراماں چلی جا رہی تھی کہ راستہ میں ایک لاش سے ٹھوکر کھا کر گری اور اس کے گھٹنے خون آلود ہو گئے۔ لوگوں نے اسے فوراً سنبھالا اور وہ پھر آگے روانہ ہو گئی۔ کچھ دور چلکر اسے ایک کیتھولک سردار ملا جو خون آلود تلوار لئے ہوئے سر سے پاؤں تک لہو میں شرابور تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑی اور بولی کہ "شکار کی خبریں سناؤ" اس نے کہا کہ "اب تلواریں نیام میں ہیں اور لاشے میدان میں"۔

اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا کہ "میری تمنا تو یہ تھی کہ گلیوں میں کم از کم گھٹنے گھٹنے تو خون نظر آتا"، سردار نے ملکہ کے خون آلود گھٹنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ "ملکۂ عالم کی یہ خواہش تو پوری ہو گئی"۔

وہ یہ سنکر بے اختیار ہنس پڑی اور رات بھر ہنستی رہی یہاں تک کہ جب ۲۵ر اگست کا آفتاب طلوع ہوا تو وہ جاگ رہی تھی اور پروٹسٹنٹ جماعت کا ایک ایک فرد موت کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو چکا تھا۔

مجموعۂ استفسار و جواب ہر دو جلد

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی جلدیں ہیں جن کے ... اصفحات میں علم و ادب تاریخ و مذہب نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے ان میں تقریباً .. ہم مسایل پر آپ کو وہ مواد ملے گا جو برسوں کی کتب بینی کی بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:۔

مسئلہ جبر و اختیار ۔ خواب کی حقیقت ۔ معاد و خلود ۔ طبقۂ نسواں اور غزلگوئی ۔ برج بابل ۔ فاسسٹ جماعت سامری کون تھا ۔ باغ ارم کی حقیقت ۔ فلسفۂ محبت ۔ بھوت پریت ۔ اصحاب کہف ۔ سالویشن آرمی ۔ ہالہ کا سبب ۔ معجزہ و کرامات ۔ فرقۂ معتزلہ ۔ مذہب و عقل ۔ طوفان نوح ۔ یاجوج ماجوج ۔ برہمو سماج ۔ طبقۂ نسواں اور تعلیم ۔ مریخ کی حقیقت ۔ منصور علاج ۔ چند الفاظ کی تحقیق ۔ اصطلاحات تصوف کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ۔

قیمت ہر دو جلد معہ محصول خریداران نگار سے للعہ ۔ غیر خریداران سے ہے ۔ منیجر نگار - لکھنؤ

ریڈیو کا ماضی، حال اور مستقبل

کہا جاتا ہے (اور جھوٹ سچ کہنے والے کی گردن پر ہے) کہ جس وقت مارکونی کی عمر ۱۹ سال کی تھی اور وہ جامعہ بولونا میں تعلیم پا رہا تھا اُسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی اور اُس نے اس خوف سے کہ کوئی اور باہمی گفتگو کو نہ سن لے، ایک ایسے طریقۂ پیام رسانی پر غور کرنا شروع کیا جو رقیبوں کی دسترس سے باہر ہو۔ جب اُس سے دریافت کیا گیا تو اُس نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ "ہاں میں بعض ایسے لوگوں سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں جن سے سوائے اس طریقہ کے کوئی اور صورت گفتگو کی ہی نہیں"۔

اٹلی کے مشہور فیلسوف شاعر ڈانٹی کی غیر فانی عاشقانہ شاعری کا سبب اُس کی محبوبہ بیٹرس بتائی جاتی ہے۔ الغرض اس میں کلام نہیں کہ محبت و حُسن کا یہ احسان دُنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ اُس نے ایک کو فلسفۂ شعر و حکمت کا دیوتا بنا دیا اور دوسرے کو وہ ذہن رسا عطا کر دیا کہ آج ہم بغیر تار کی مدد کے ہزاروں میل کے فاصلہ پر ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے ہیں، اور آنِ واحد میں تمام دنیا کی خبریں گھر بیٹھے آرام سے سن سکتے ہیں۔

۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء سب سے پہلی تاریخ تھی جب مارکونی نے انگلستان سے لاسلکی اشارات یا بے تار کے پیام امریکہ روانہ کئے۔ دنیا دفعتاً چونک پڑی، اخبارات میں ہلچل مچ گئی، بعض نے اس کا دبی زبان سے اعتراف کیا، اور بعض نے اسے چانڈو خانہ کی گپ سمجھکر خوب ہنسی اُڑائی، چنانچہ اڈیسن نے بھی اس کو جھوٹ ہی سمجھا اور دے ورسٹ نے بھی اس کے قبول کرنے میں پس و پیش کیا حالانکہ وہ خود لاسلکی کے مسائل پر غور کر رہا تھا۔

اسکے بعد مارکونی نے ایک مختصر سا رسالہ اپنے نظریہ کی تائید میں شائع کیا اور آخر کار رفتہ رفتہ ہر منکر اسکی ایجاد کی صحت پر ایمان لے آیا۔

یہ بات اب سے تقریباً ۳۴ - ۳۵ سال اُس طرف کی ہے۔ لیکن اس دوران میں اس ایجاد نے کتنی ترقی کی؟ اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ امریکہ کی وزارت تجارتی نے جو اعداد پیش کئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ روزانہ تمام دنیا میں نو کروڑ سے زیادہ انسان لاسلکی اسٹیشنوں کے پیغامات سنتے اور اُن سے فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ ٹیلی فون سے باتیں کرنا، تصویریں ادھر سے اُدھر بھیجنا، ہزاروں میل دور کی چیز کو

گھر بیٹھے دیکھ لینا، برقی قوت کو جہاں جی میں آئے پہونچا دینا، اور یہ سب کچھ بغیر تار کی مدد کے کرنا، مارکونی کی اسی ایجاد کا معجزہ ہے جس پر انسانی تمدن کی خدا معلوم کتنی ترقیاں آئندہ ہونے والی ہے ہیں اور کیسے کیسے عجائب و غرائب اس سے ظاہر ہونے والے ہیں۔

سب سے پہلے لاسلکی پیغامات اُن اشارات کی صورت میں بھیجے جاتے تھے جو تار برقی میں رائج تھے یعنی صرف "کھٹ کھٹ، کھٹاکھٹ" کے مقررہ اشاروں سے پیام روانہ کئے جاتے تھے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ ہم آواز کو بھی اسی طرح منتقل کر سکتے ہیں اور اس تحقیق کے بعد ہی لاسلکی ٹیلیفون رائج ہو گیا جس کے لئے بڑے بڑے اسٹیشن طیار کئے گئے اور جہاں سے روزانہ خبریں، قصے، کہانیاں، گانا رونا سبھی کچھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ ایسے اسٹیشنوں کو براڈکاسٹنگ اسٹیشن کہتے ہیں جس کا ترجمہ حیدرآباد میں "نشرگاہ" کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں ایسے اسٹیشن متعدد ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قوی اسٹیشن دہلی کا ہے، اس کے بعد بمبئی کا اور پھر کلکتہ کا جہاں سے روزانہ صبح و شام ہماری تفریح اور وسعت معلومات کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں ابھی اس کا رواج عام نہیں ہوا اور نہ لاسلکی پیغام رسانی کی زیادہ ترقی یافتہ صورتیں یہاں نظر آتی ہیں، لیکن یورپ و امریکہ میں تو لاسلکی زندگی کا جزو ہو کر رہ گئی ہے اور حیات انسانی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس سے اس کا تعلق نہ ہو۔ لوگ ناپیداکنار سمندر کا سفر کر رہے ہیں اور اپنے وطن کے اعزہ و احباب سے گفتگو بھی کرتے جاتے ہیں، ہوائی جہازوں میں بیٹھے ہزاروں فٹ کی بلندی پر اُڑے چلے جا رہے ہیں اور اپنے دفتر کے کلرکوں، گھر کے خادموں کو ہدایات بھی کرتے جاتے ہیں۔ یہ سب اسی لاسلکی کا کرشمہ ہے جس نے زمان و مکان کے مفہوم کو بالکل بدل دیا ہے، یعنی نہ وقت کی تنگی و وسعت کا سوال اب رہا ہے جو پہلے پایا جاتا تھا اور نہ مقام کی دوری و نزدیکی کوئی چیز رہ گئی ہے۔

لاسلکی پیام رسانی میں جب کامیابی ہو گئی تو مارکونی نے غور کیا کہ کسی طرح تصویروں کو بھی منتقل کرنا چاہئے، چنانچہ اُس نے اس میں بھی کامیابی حاصل کی اور اب مغرب میں آواز کے علاوہ تصویریں، اعداد و شمار، تحریریں اور نقشے وغیرہ سب جوں کے توں منتقل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص جرم کر کے بھاگے تو اُس کی تصویر یورپ بھر میں ایک ایک بندرگاہ پر ایک ایک اسٹیشن پر لاسلکی کے ذریعہ سے بھیجی جا سکتی ہے اور اگر وہ کوئی تحریر چھوڑ گیا ہو تو وہ بھی بجنسہٖ ہر جگہ منتشر کی جا سکتی ہے۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اب مادی چیزیں بھی اِدھر سے اُدھر لاسلکی کے ذریعہ سے منتقل ہو سکتی ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ توجہ اب اس کوشش میں صرف کی جا رہی ہے کہ قوت بینائی کو بھی لاسلکی

کے ذریعہ سے منتقل کیا جائے، اس کا نام انگریزی میں Television ہے یعنی دور سے دیکھ لینا، لیکن بہ نظر اختصار اگر "لاسلکی آنکھ" کہیں تو غالباً نادرست نہ ہوگا، لیکن اس میں بھی بڑی حد تک کامیابی ہوگئی ہے اور ہر چند ہندوستان میں تو نہیں لیکن امریکہ و یورپ میں ٹیلی فون کے ساتھ یہ "لاسلکی آنکھ" بھی لگا دی گئی ہے جس کے ذریعہ سے ہم کو بات کرنے والے کی صورت اور اُس کے حرکات و سکنات بھی نظر آنے لگتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ انگلستان میں ملک معظم کی تاجپوشی کی رسم ادا ہو رہی ہے، ڈربی میں گھوڑ دوڑ کا اجتماع ہے، امریکہ میں گھونسہ بازی کا مقابلہ ہو رہا ہے، ہندوستان میں گاما پہلوان زبسکو سے کشتی لڑ رہا ہے، برٹش چینل میں کیمرج اور آکسفورڈ کے درمیان کشتی کی دوڑ کا مقابلہ ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ ان تمام مناظر کو ہم انسانی آنکھ سے بغیر اُس جگہ گئے ہوئے دیکھ سکیں، لیکن اگر ہمارے پاس ایسا ریڈیو موجود ہے جس میں لاسلکی آنکھ لگی ہوئی ہے تو ہم ان مناظر کو دیکھ بھی سکینگے، اور وہاں کی آوازیں بھی سُن سکیں گے۔ یورپ و امریکہ میں اس کا رواج بہت بڑھ گیا ہے لیکن ابھی تک یہ لاسلکی آنکھ اتنی ارزاں نہیں ہوئی کہ ہر شخص اُسے اپنے پاس رکھ سکے۔ لیکن اس کی کوشش برابر جاری ہے اور یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا کہ ایک معمولی مزدور بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکے گا۔ دوسری کوشش جو یقیناً بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوگی یہ ہو رہی ہے کہ لاسلکی سے بجلی کی قوت کو بھی منتقل کر سکیں یعنی موٹروں، مشینوں، اور بحری و ہوائی جہازوں کو بھی دور ہی سے بجلی کی قوت پہونچائی جائے اور وہ چلنے لگیں۔ اس سے مقصود یہ کہ پٹرول گیس یا کوئلہ وغیرہ سے قوت پیدا کرنے کیلئے جو آلات جہازوں، موٹروں وغیرہ میں لگائے جاتے ہیں وہ ہٹا دئے جائیں اور اُن کو لاسلکی اسٹیشنوں سے براہ راست قوت پہونچا کر حرکت میں لے آیا جائے۔ چنانچہ امریکہ کے ایک سائنس داں نے ایسا آلہ طیار کر لیا ہے جو آواز سے متاثر ہو کر گردش میں آجاتا ہے اور وہ زمانہ دور نہیں ہے جب ہم کو موٹروں کے لئے پٹرول کی ضرورت نہ ہوگی اور دہلی کے اسٹیشن سے لاسلکی قوت کہربائی حاصل کرکے ہم موٹر کو حرکت میں لاسکیں گے ۔۔۔ اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ لاسلکی اسٹیشنوں سے جو برقی موجیں آوازوں کو اپنے ساتھ لیکر چلتی ہیں وہ دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک کو Long کہتے ہیں اور دوسری کو Short اول الذکر کا ترجمہ طویل یا لمبی موجیں کیا جاتا ہے اور دوسری کا چھوٹی موجیں، حالانکہ صحیح ترجمہ اونچی اور نیچی موجیں ہے کیونکہ موجوں کی رفتار کی لمبائی یا چھٹائی کی ناپ ان کی بلندی سے متعلق ہے۔ یعنی جو موجیں فضا میں زیادہ بلند جا جاکر واپس آئیں گی انھیں لانگ ویوز (Long) کہیں گے اور جو زیادہ اوپر نہ جائیں گی اُنھیں شارٹ ویوز (Short) کہیں گے۔ امریکہ و یورپ میں پہلے اونچی موجوں کے اسٹیشن زیادہ تھے۔ بڑے اسٹیشنوں میں ان موجوں کی اونچائی تین ہزار میٹر سے بھی زیادہ ہوتی تھی اور چھوٹے اسٹیشنوں میں ۲۰۰ میٹر سے لیکر ۶۰۰ میٹر تک۔ لیکن ایسے اسٹیشنوں کی تیاری میں بہت صرف آتا تھا اس لئے ۱۹۱۶ء میں مارکونی نے غور کرنا شروع کیا کہ کیا

نیچی موجوں سے کام نہیں لیا جا سکتا اور اس میں اسکو بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ کیونکہ ان موجوں کے پیدا کرنے کیلئے جو قوت بجلی کی صرف ہوتی ہے وہ بہت کم ہوتی ہے اور نتیجہ بھی بہتر نکلتا ہے۔ چنانچہ اب یورپ و امریکہ میں نیچی موجوں سے بھی آوازیں منتقل کی جاتی ہیں اور دور دراز مقامات کے لئے تو یہی موجیں زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ دہلی کا اسٹیشن اونچی موجوں کا ہے اور غالباً وہ اپنی آوازیں یورپ وغیرہ دور کے مقامات تک نہیں پہونچا سکتا۔ یہ اسٹیشن نیچی موجوں سے کیوں کام نہیں لیتا اس کا حال ہم کو نہیں معلوم، اس کے ڈائرکٹر صاحب اس مسئلہ پر شاید کوئی روشنی ڈال سکیں۔

یہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ لاسلکی طریقہ سے نہ صرف آواز بلکہ تصویریں بھی منتقل ہو سکتی ہیں، اور لوگوں کی تحریریں بھی چنانچہ اس اُصول کی بنا پر اب یہ سوچا جا رہا ہے کہ کیوں نہ لوگوں کے پیغامات بجنسہٖ منتقل کر دئے جایا کریں۔ اس وقت تو یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنا پیغام انگریزی حروف میں لکھ کر تار گھر میں دیتے ہیں اور وہ مخصوص اشاروں کے ذریعہ سے کھٹ کھٹ کر کے روانہ کرتا ہے اور اگر ٹیلی فون سے کہنا ہوتا ہے تو انگریزی زبان میں اُسے ادا کرتا ہے۔ لیکن اب یہ فیصلہ ہونے والا ہے کہ جس شخص کا جو پیام جس صورت اور جس زبان میں بجنسہٖ وہی منتقل کر دیا جائے یہاں تک کہ اس طرح ہم رسالے کے رسالے اور کتاب کی کتاب دوسری جگہ منتقل کر سکتے ہیں۔ اس میں ایک آسانی تو یہ ہے کہ وقت بہت کم صرف ہوگا اور دوسرے یہ کہ اُجرت بہت کم ہو جائیگی۔ اسوقت تو انگلستان و امریکہ کے درمیان ایک منٹ تک لاسلکی ٹیلیفون پر بات کرنے کی اُجرت ایک اشرفی ہے، لیکن اگر اس کوشش میں کامیابی ہوگئی تو یہ گرانی باقی نہ رہے گی کیونکہ اس صورت میں معاوضہ الفاظ یا وقت کے حساب سے نہ لیا جائیگا بلکہ ناپ کے لحاظ سے لیا جائیگا یعنی یہ کہ ایک پیغام نے کتنی جگہ لی، ایک رسالہ یا اخبار یا کتاب نے کتنے مربع انچ یا سنٹی میٹر جگہ گھیری۔

وہ حضرات جنھوں نے ریڈیو لاسلکی طریق پیام رسانی پر غور کیا ہے اُن سے یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی کہ جس قوت کے ساتھ اسٹیشن کسی آواز کو منتقل کرتا ہے وہ فضا میں پہونچکر کمزور ہو جاتی ہے اور اُس کا اکثر حصہ مفقود ہو جاتا ہے، چنانچہ یہی سبب ہے کہ دہلی کے اندر جتنی صاف آواز وہاں کے اسٹیشن سے آتی ہے اتنی لکھنؤ میں نہیں آتی اور جتنی لکھنؤ میں آتی ہے، کلکتہ میں نہ آتی ہوگی۔ اس مسئلہ کی طرف بھی ماہرین پوری طرح توجہ کر رہے ہیں اور تجربات میں مصروف ہیں۔ یقین ہے کہ بہت جلد اس کا بھی انسداد ہو جائے گا اور فضا کی جو دوسری آوازیں ریڈیو سے سنائی دیتی ہیں وہ بہت کم ہو جائیں گی۔

اس حد تک تو ہم نے صرف لاسلکی کی ایجاد اور اُس کی آیندہ ترقی کے امکانات پر اظہار خیال کیا ہے لیکن آیندہ کسی وقت ہم یہ بھی بتائیں گے کہ اس سے پبلک کو کیا کیا فائدے اور کس کس طرح پہونچائے جا سکتے ہیں، اور براڈکاسٹنگ اسٹیشنوں کو اپنے پروگرام میں کیا ایسی تبدیلیاں کرنی چاہئیں کہ تفریح و افادہ دونوں مدعا پوری طرح حاصل ہو جائیں۔

قرض

بابو راجگوپال سنگھ ۔ جگدیپ سنگھ! کیا ہوا؟ آج گاؤں میں جاکر حکم سنا دیا یا نہیں؟

جگدیپ سنگھ ۔ ہاں سرکار! میں نے حکم سنا دیا ہے اور رعایا سب کی سب حضور کی خوشی میں شریک ہونیکو تیار ہے۔ لیکن رام جنم سنگھ ابتک راضی نہیں ہوا اور بات دراصل یہ ہے کہ وہ گاؤں میں سب سے زیادہ غریب ہے کھانے کو تو جڑتا نہیں قرض کہاں سے لگائیگا۔

بابو راجگوپال سنگھ ۔ میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ سب کو اپنے حصہ کی رقم ادا کرنی پڑے گی اور اسے سب لوگ قرض کیوں سمجھتے ہیں۔ کیا تم نے یہ نہیں کہا کہ لگان میں یہ رقم وضع ہوتی رہے گی۔ سوچو تو جگدیپ سنگھ! اتنے بڑے گھر کی بات ہے۔ اگر میری طرف سے کوئی کمی ہوگئی تو کیسی جگ ہنسائی ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا منھ اس گھرانے میں شادی کا نہ تھا۔ یہ تو جو کچھ ہوا اسے لڑکی کا سوبھاگ سمجھو۔ پچاس ہزار تلک کی رقم کوئی معمولی چیز نہیں۔ میں کیا سامان کر سکتا ہوں وہ تو ایشور پورا کرے سیٹھ بھگوان داس کا کہ اس نے تمسک پر چالیس ہزار دینے کا وعدہ کرلیا ہے۔ اسوقت تو عزت بچ جائے گی۔ آیندہ کچھ نہ کچھ سامان ہو رہیگا۔ اور ہے وہ سچا آدمی وقت پر دھوکا نہ دیگا۔ پھر باقی روپیوں کی کیا سبیل ہوتی اگر یہ لوگ وقت پر کام نہ آئے تو کس کام کے۔ میں آگ لگا کر سارے گاؤں کو پھونک نہ دوں گا؟

جگدیپ سنگھ ۔ سرکار بات تو بالکل سچ ہے۔ لیکن رام جنم سنگھ ایک تو مفلس ہے بھی دوسرے بات کا وہ پکا ہے۔ مجھے تو امید نہیں کہ وہ یہ قرض دے سکے۔

بابو صاحب ۔ کیا کہا؟ اس کی ساری ہٹ دھرمی رہجائے گی۔ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ وہ کیسے ادا نہیں کرتا۔ اس کا دیوتا ادا کریگا۔ میں بھی آخر زمیندار کا بچہ ہوں۔ اگر اس سے روپئے نہ اگلوائے تو نام نہیں۔ اس بستی میں رہنا مشکل کردوں گا اور بھیک منگوا چھوڑوں گا۔

بابو صاحب کو انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں دیکھ کر جگدیپ سنگھ نے زیادہ چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش وہاں سے ٹل گیا۔

(۲)

بابو راجگوپال سنگھ موضع جگدیش پور کے تھے تو متوسط درجہ کے زمیندار لیکن ظاہری شان و شوکت ہمیشہ ایسی

تھی کہ دیکھنے والے انھیں لکھ پتی ہی سمجھتے تھے اور سچ یہ ہے کہ اسی ظاہری ٹیپ ٹاپ کی بدولت وہ اپنی لڑکی کی نسبت چھوٹا ناگپور کے ایک دالی ریاست کے لڑکے سے کرنے میں کامیاب ہوئے۔ صورت یہ ہوئی کہ گرمی کے موسم میں دونوں کی مسوری میں ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی۔ کچھ روز دعوتوں کا سلسلہ رہا اور پھر بعض احباب کے ذریعہ سے بابو راجگوپال سنگھ نے یہ گفتگو چھیڑ دی اور بات پختہ ہوگئی۔

بابو راجگوپال سنگھ سخت جابر زمیندار تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے احکام کی تعمیل میں کوتاہی کرسکے۔ رعایا سے وہ بری طرح بیگار لیتے اور اگر کوئی جان چراتا تو اس کی اچھی طرح خبر لیتے۔ سنا گیا ہے کہ ایک بار دو تین چماروں نے اپنی بیماری کا عذر کرکے کھیت میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جب زیادہ بات بڑھی تو سپاہی کو پیٹا بھی۔ اُسوقت تو بابو صاحب خاموش رہے لیکن جب کچھ زمانہ گزر گیا اور کسی کو یاد بھی نہ رہا تو موقع سے ان چماروں کو اپنے یہاں بلوا کر بھٹے میں جھنکوا دیا۔ حقیقت کی خبر نہیں لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ تینوں کے تینوں یک بیک غائب ہوگئے اور پھر انکا آج تک کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ ممکن ہے گاؤں والے شبہ کی بنا پر ایسا کہتے ہوں، بہرحال بابو صاحب کے نام سے بستی کا بچہ بچہ تھراتا تھا اور جب ان کا سپاہی کسی کے مکان پر پہونچ جاتا تو وہ گھبرا جاتا

بابو صاحب کی اقتصادی حالت ایسی بری نہ تھی کہ اگر وہ انجام پر نظر رکھتے اور کفایت شعاری سے کام لیتے تو لڑکی کی شادی کے وقت قرض کی ضرورت پڑتی۔ لیکن اول تو وہ فضول خرچ بہت تھے، دوسرے راجہ کے گھر میں لڑکی بھیجنی تھی۔ شادی کی تمام نمائشیں اسی اعتبار سے ہونی چاہئے تھیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کیا کچھ سامان کی ضرورت نہ رہی ہوگی۔ ایک زمیندار، ایک دولتمند اپنی غیر ضروری تمناؤں کی ناکامی بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ اپنی بڑھتی ہوئی امیدوں پر اپنی محکوم دنیا کی ہر چیز قربان کردینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ بابو صاحب بھی زمیندار ہی تھے۔ ان کے اختیارات دوسرے زمینداروں سے کسی طرح کم وسیع نہ تھے۔ قرض کے لئے انھوں نے سیٹھ بھگوانداس کوتاکا اور تمسک پر چالیس ہزار کا انتظام کرلیا باقی روپیوں کے لئے اپنے اسامیوں کو مجبور کیا۔ ہر کسان پر حسب حیثیت سو روپیہ سے لیکر پچاس تک کی رقم باندھ دی اور شرط یہ ہوئی کہ آیندہ چند سال کے اندر یہ رقم لگان میں محسوب ہو جائیگی۔

اسامی اچھی طرح جانتے تھے کہ اس وعدہ کی کیا حقیقت ہے، کیونکہ جو روپئے لئے جارہے تھے ان کی کوئی رسید تو ملتی تھی نہیں کہ اس کے بل بوتے پر آیندہ وصولی کی اُمید ہو سکے۔ سب کچھ بابو صاحب کی عنایتوں پر منحصر تھا لیکن باوجود اس کے کسی میں ہمت نہ تھی کہ انکار کرے خواہ یہ قرض انھیں قرض ہی لیکر کیوں نہ دینا پڑے۔ ایک بیچارہ رام جنم ہی ایسا تھا جو بالکل تہیدست تھا۔ اسے قرض ملنے کی بھی اُمید نہ تھی۔ صرف دو بیگہ کے کاشتکار کو قرض کون دیگا۔ اور اگر مل بھی جائے تو ادا کہاں سے کرے گا۔ مشکل سے بال بچوں کے ساتھ روکھا سوکھا کھا کر پڑ رہتا تھا سارا گاؤں واقف تھا کہ چھ مہینے پہلے اس نے اپنی لڑکی دیومتی کی شادی گاؤں بھر سے کنیا دان مانگ کر کی تھی۔

وہ کہاں سے زمیندار کی اس خوشی میں شریک ہو سکتا تھا۔ اس نے جگدیپ سنگھ کے سامنے اپنی معذوری تو ظاہر کردی تھی لیکن اسے اطمینان نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس کا حکم ہے۔ وہ بہت مایوس تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ خود ہی سرکار میں حاضر ہو کر اپنا درد دکھ کہہ سنائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ میری حالت خود بابو صاحب سے پوشیدہ نہیں۔ میرا خاندان برابر اس سرکار کا وفادار رہا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ بابو شمبھو دیال سنگھ (بابو صاحب کے باپ) کو راستہ میں چوروں نے گھیر لیا تھا۔ اتفاقاً پتاجی ادھر جا نکلے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالکر انھیں بچا لیا۔ اسی کے انعام میں یہ دو بیگھ کھیت ملے تھے اور پتاجی وہاں ملازم بھی رکھ لئے گئے۔ بابو راجگوپال سنگھ اُسوقت بچے نہ تھے۔ انھیں ہمارے واقعات معلوم ہیں۔ یہ باتیں ایسی نہیں کہ بھول جائیں۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ میرا خیال نہ کریں۔ وہ ضرور مجھے اس بارسے نجات دیدیں گے۔

(۳)

صبح کا وقت ہے۔ فطرت نے سارے عالم میں شادابی و تازگی کی ایک لہر دوڑ رہی ہے۔ اور کائنات پھر اسی کشمکش میں مبتلا ہو جانے کے لئے انگڑائی لے چکی ہے جس سے تھک کر ایک عارضی سکون پر مجبور ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آفتاب کی ساری تجلی پاشیاں محض اسی ایک مقصد کے لئے وضع ہوئی ہیں کہ وہ کائنات کو شعاع اُمید سے منور کرتی رہیں۔ اور حقیقتاً یہی وہ شئے ہے جس پر دنیا کی رونق منحصر ہے۔

رام جنم غریب ضرور پیدا ہوا تھا لیکن فطرت کی تمام فیاضیوں سے مستفید ہونے کا حق اسے بھی تھا۔ قدرت اس کے لئے بخیل نہ تھی۔ اس کے دل میں بھی امید و تمنا کے جذبات پیدا اور فنا ہوتے تھے۔ اس نے اگر ایک انسان سے یہ توقع قائم کرلی تھی کہ اس کی مجبوریاں، اس کی تہیدستیاں دل میں رحم و لطف کا شائبہ پیدا کر سکیں گی تو کوئی خلاف عقل بات نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ایک طبقہ کی خود غرضیوں اور نفسانیت نے غریبوں کا یہ حق بھی غصب کرلیا ہے کہ اپنی مصیبتوں کا گلہ کر سکے، ظلم و ستم کے خلاف فریاد کر سکے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ایک انسان کی بقائے حیات منحصر ہے دوسرے انسان کو غذا بنا لینے پر۔ پھر ذی اختیار ہستیاں اپنی مسرتوں اور شادکامیوں پر غریبوں کو بے اختیار و بے چارہ انسانوں کو قربان کر دینے سے کیوں دریغ کرنے لگیں۔ غریب کو صرف اس لئے زندہ رہنا چاہئے کہ وہ امیروں کی عیش و نشاط کے لئے سامان فراہم کر سکے ورنہ اس کی زندگی کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی۔

رام جنم کے دل میں امید و بیم کا دریا موجزن تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا سر نیچا کئے پشت کی جانب ہاتھ پر ہاتھ باندھے زمیندار کے مکان کی طرف جا رہا تھا۔ اسے تمام شب نیند نہیں آئی تھی اور اس لئے انتہائی ضبط کے باوجود وہ اپنے گھر سے بہت سویرے ہی نکل کھڑا ہوا۔ آفتاب نکل چکا تھا لیکن امیروں کی صبح اتنے سویرے کیوں ہونے لگی۔ انھیں قدرت نے صرف سکون و عیش کے لئے وضع کیا ہے۔ کام ان کے لئے دوسرے کرتے ہیں

پھر صبح کی یہ چند ساعتیں اگر ضائع ہو بھی گئیں تو ان کا کیا بگڑ جائے گا۔ ان کے محاصل میں کونسی کمی آجائیگی۔ قدرت کی عنایات سے انھیں زیادہ سے زیادہ لطف حاصل کرنا چاہیئے۔ رام جنم کو کئی گھنٹے انتظار کرتے گزر گئے۔ تب کہیں جاکر بابو صاحب کی خدمت میں شرف باریابی حاصل ہو سکا۔

بابو صاحب نے جسوقت رام جنم پر نظر ڈالی رام جنم کانپ رہا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ جائے لیکن وہ اسدرجہ گھبرا گیا تھا کہ ایک لفظ بھی زبان سے نہ کہہ سکا۔ ادھر بابو صاحب اسے دیکھتے ہی غصہ سے بھبوت ہو گئے۔ کڑک کر بولے۔

"رام جنم سنتا ہوں تجھے اب میرے حکم کی بھی پرواہ نہیں رہی؟

رام جنم۔ کو... ن... کہتا... ہے... سرکا... ر

بابو صاحب۔ کل میرے آدمی کو تو نے کیا جواب دیا تھا۔

رام جنم۔ کو... چھ تو... نہیں... مالک۔ صرف... روپیوں کا عذر ہے۔ یہ پچاس کی رقم تو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی کہاں سے لاؤں گا۔

بابو صاحب۔ نمکحرام کہیں کا۔ تجھے شرم نہیں آتی ہمارے ہی دئے ہوئے کھیت پر اُچھل رہا ہے اور آج مجھے ہی چڑانے آیا ہے۔

رام جنم۔ سچ ہے سرکار! کون نہیں جانتا ہے کہ آپ ہی کی عنایتوں سے بال بچوں کی پرورش کر رہا ہوں پھر آپ سے بڑھکر یہ حال کون جان سکتا ہے۔ خود خیال کیجئے اتنی بڑی رقم میرے پاس کہاں سے آئی کوئی قرض دینے والا بھی تو نہیں۔ آپ مجھ پر رحم نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔

بابو صاحب۔ اپنی پنڈتئی رہنے دے۔ میں تیری چالیں خوب سمجھتا ہوں۔ مجھے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں ایک تیری مثال قائم کرکے سارے گاؤں کو خراب نہیں کر سکتا۔ یاد رکھ روپئے کبھی چھوڑے نہیں جا سکتے جہاں سے جی چاہے دے۔ اور یہ کیا کہتا ہے کہ قرض کہاں سے ادا کروں گا۔ میں نے تو کہدیا ہے کہ ہر سال لگان سے یہ رقم وضع ہوتی رہے گی اور وہی روپے قرض خواہ کو دیدینا۔

رام جنم۔ سرکار! یہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے دینے والا کون ہے۔ کوئی ایک پیسہ نہیں دیگا سرکار!

بابو صاحب۔ تو تیرا مطلب یہ ہے کہ تو روپئے دینے کو کسی طرح تیار نہیں۔

رام جنم جواب دینا چاہتا تھا لیکن اتفاقاً اس کی نظر اوپر اُٹھی —— اور پھر سہم کر رہ گیا۔ بابو صاحب پھر کڑکے "رام جنم! بول! چپ کیوں کھڑا ہو گیا۔ تجھے اقرار کرنا پڑے گا۔ بول کیا کہتا ہے" رام جنم خاموش ہی رہا۔ وہ کیا جواب دیتا۔ انکار کی اجازت نہیں اور روپیوں کا سامان محال۔ معلوم نہیں بابو صاحب نے اسکی

خاموشی کی تاویل کس طرح کی۔ غریب کی گفتگو بھی ناگوار ہوتی ہے اور خموشی بھی شوخی و شرارت سے تعبیر کی جاتی ہے۔
بابو صاحب یہ کیونکر برداشت کرلیتے کہ ایک کسان ایک خس دنما شناک، سے بھی کم درجہ کا انسان ان کی خواہشات کا جواب خاموشی سے دے۔ بابو صاحب چیخ اُٹھے۔ جگدیپ سنگھ! جگدیپ سنگھ!!

جگدیپ سنگھ۔ "حاضر ہوا سرکار!" کہتے ہوئے آگے بڑھے۔

بابو صاحب۔ دیکھو آج یہ میرے سامنے بھی ہیکڑی دکھانے آیا ہے۔ میرے منھ پر روپیوں سے انکار کرنے آیا ہے۔ اسے ابھی میرے سامنے باندھکر پچیس جوتے لگاؤ۔ دیکھتا ہوں کہاں تک یہ اپنی ہٹ پر قائم رہتا ہے۔

رام جنم نے سب کچھ سنا اور خاموش سنتا رہا۔ بے بس تھا۔ کمزور تھا۔ اس کا خون کھول رہا تھا، دل و جگر جل رہے تھے۔ آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ لیکن زبان کھولنے کی اجازت نہ تھی۔ راجپوت تھا۔ جان پر کھیل جانا کوئی بات نہ تھی۔ لیکن وہ نتیجہ پر غور کرنے کے لئے مجبور تھا۔ وہ بال بچوں کے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی کی کون خبر لیگا۔ اسے پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی سامان نہیں ہے۔ یہ تمام تصویریں اس کے سامنے نہایت تیزی سے آ آ کر گزرنے لگیں۔ اس کا سارا جوش و خروش سرد پڑنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے

شریف سے شریف نفس بھی جب دیکھتا ہے کہ جان و آبرو کی حفاظت میں اس کی تمام کاوشیں یکلخت بیکار ہو کر رہ گئی ہیں اور جان دیدینا بھی ان کے بس کی بات نہیں رہی تو پھر وہ فریب سے کام لینا شروع کر دیتا ہے خود اس کی طبیعت گوارا کرے یا نہ کرے لیکن مصلحتیں اسے مجبور کر دیتی ہیں۔ رام جنم چاہتا تو اپنی جان پر کھیل کر بابو صاحب سے اپنی بے عزتی کا عوض لے لیتا۔ خود اس کا دلی جوش بار بار اس پر آمادہ کر دیتا تھا۔ لیکن اسے خاندان کا خیال تھا اس لئے زندہ رہنا چاہتا تھا وہ روتا ہوا بابو صاحب کے قدموں پر گر پڑا۔

"سرکار! معاف کیجئے۔ جہاں سے بنے گا روپئے لا حاضر کروں گا۔ تھوڑی مہلت دیجئے"

بابو صاحب یہی چاہتے تھے۔ اپنے مطلب کی بات سنکر خوش ہوگئے۔ انھیں فریب کا شبہ بھی نہیں ہوا۔ کیوں ہوتا وہ جب چاہتے رام جنم کو پکڑوا کر سزا دے سکتے تھے۔

اجازت لیکر رام جنم مکان واپس آیا۔ لیکن اس حال میں کہ چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے، بیوی نے یہ حال دیکھا تو پریشان ہوگئی۔ بار بار پوچھ رہی تھی لیکن رام جنم صرف آنسوؤں اور سسکیوں سے جواب دیتا رہا۔ "مصیبت میں کسی کے ہمدردی کے الفاظ معلوم نہیں کیوں جذبات میں ایسی تحریک پیدا کر دیتے ہیں جیسے زخم کو چھیڑ دینا، کہہ سکتے ہیں۔ رام جنم کے زخم کو نشتر لگ گیا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر بہا دیر تک درد سے بلبلاتا رہا اور جب اسے سکون ہوا تو، بیوی زیادہ بیتاب ہوگئی۔

رام جنم۔ "منی! آج تو کسی طرح بچکر نکل آیا۔ لیکن کیا معلوم پھر کیا حشر ہو۔ اب تو دنیا اندھیر معلوم ہوتی ہے راجپوت

ہو کر اتنی بے عزتی سہی نہیں جاتی۔ جان دیدینا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن عزت کی بربادی ہرگز مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ اور یہاں میری عزت ہی کا سوال ہے۔ یہی چیز مجھ سے چھینی جا رہی ہے۔ بابو صاحب کو جانتی ہو اپنی ہٹ کے کیسے پکے ہیں۔ وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتے اور روپیوں کا انتظار کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ ابتو اور کوئی صورت معلوم نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ یہاں سے کہیں بھاگ جاؤں۔

منی — کہاں جاؤ گے؟ اور ہم لوگوں کو کس پر چھوڑ دو گے۔ رام اسٹیس ررام جنم کا دو برس کا چھوٹا بچہ) کو کون پالے گا اور یہ کس کس کا منہ تکتا پھرے گا۔

رام جنم — نہیں منی! میں تم سب کو ساتھ لیکر جانا چاہتا ہوں۔ اس بستی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں گا۔ مجھ سے ایسا پاپ کیسے ہو سکے گا کہ خود تو مصیبت سے نکل جاؤں اور تم لوگوں کو اس میں چھوڑ جاؤں۔ تم ہی لوگوں کے لئے تو یہ ساری گالیاں برداشت کیں ورنہ کیا آج بابو صاحب سے اپنی ذلت کا بدلہ لئے بغیر واپس آتا؟

منی — پھر کہاں کا ارادہ ہے؟ غیر جگہ کس طرح گزرے گی۔ وہاں ہمیں کون پوچھیگا۔ یہ تو جنم استھان ہے برے بھلے گزر ہو جاتی ہے، پرائے لوگوں کو ہم پر کیوں ترس آنے لگا۔

رام جنم — اب کچھ ہو منی! میں ارادہ کر چکا ہوں۔ اگر کوئی سامان نہ ہو سکے گا تو فاقہ سے تڑپ تڑپ کر جان دیدوں گا۔ یہ سب کچھ گوارہ کر لوں گا لیکن بے عزتی کی زندگی تو مجھ سے بسر نہیں ہو سکتی۔ اور پھر یہیں کون بڑا سکھ نصیب ہے۔ دوسری جگہ بھی وہی ایشور ہے جو یہاں ہے وہاں بھی کھانے کو دے سکتا ہے۔ کم از کم اتنا تو ہو گا کہ وہاں مجھے کوئی جوتے مارنے کی دھمکی تو نہیں دے سکتا — آج ہی تیار ہو جاؤ۔ رات کی تاریکی میں ہم لوگ یہاں سے نکل جائیں تو اچھا ہے۔

شوہر کی باتیں سنکر منی زیادہ بدحواس ہو گئی۔ اس کا دل گھر چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا — جہاں زندگی کا بیشتر حصہ گزار چکی تھی وہاں اسے مرنے کی اجازت نہ تھی — وہ سوچ رہی تھی لیکن کوئی اور صورت اس کی سمجھ میں نہ آئی آخرکار اٹھی اور روانگی کی تیاریاں کرنے لگی — گھر میں تھوڑا سا جوار کا آٹا تھا اس کی روٹیاں پکائی گئیں۔ سالن اور سبزی کی جگہ مرچ اور لہسن سے بھرتے نے لی۔ دو سیر ستو ایک پوٹلی میں باندھ لیا گیا جو ٹوٹے پھوٹے کھانے کے برتن تھے وہ الگ گٹھری میں باندھ لئے گئے پرانے اور کثیف کپڑوں کی بھی ایک گٹھری ہوئی اور پھر ان دو تین الگ الگ گٹھریوں کو ایک ساتھ ایک بوسیدہ دری میں لپیٹ کر باندھ لیا گیا۔ اس طرح ایک پورے خاندان کے جملہ لوازم حیات صرف ایک گٹھری میں تبدیل ہو کر رہ گئے۔

شب کی تاریک فضاء اگر ایک طرف جرم و معصیت کا دروازہ کھول دیتی ہے تو دوسری طرف بہیترے مظلوم اور شریف نفوس کی عزت و جان کے لئے پردہ پوش بھی ثابت ہوتی ہے۔ رام جنم نے بھی ایسی ہی مناسب گھڑی میں

گھراور گاؤں پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور رخصت ہوگیا - آگے بڑھ کر اس نے منی سے کہا چلو منی! ہم لوگ اپنے کھیت پر سے ہوتے ہوئے چلیں - آخری بار ان درختوں سے بھی رخصت ہولیں جنکی پرورش اپنے خون کو پانی کرکرکے کرتے رہے ہیں -

منی گود میں رام استیس کو اُٹھائے ہوئے تھی اور رام جنم گٹھری سر پر رکھے ہوئے تھا - اسی طرح یہ دو آدمیوں کا قافلہ بہار شریف ہوتا ہوا گیا پہونچا - گیا سے ڈوبھی روڈ اور پھر وہاں سے اس سڑک پر آگیا جسے شیر شاہ نے اپنے مختصر دور حکومت میں تعمیر کرایا تھا - وہاں سے ان لوگوں نے کلکتہ کا رُخ کیا -

روزانہ سفر اسی طرح جاری تھا - جہاں شام ہوتی وہیں صبح کی جاتی - اکثر راتیں درختوں کے نیچے بسر ہوتیں منی رام استیس کو سینے سے لگاکر پڑ رہتی - رام جنم کو انتہائی تکان کے باوجود بھی شب کی زیادہ گھڑیاں اپنی قسمت پر آنسو بہاتے گزر جاتیں -

مصیبت تنہا نہیں آتی، یہ ایک حقیقت ہے اور ایسی صورت میں انسان کا مجبور محض ہوجانا ایسی جاں گسل حقیقت ہے جس کی اہمیت کو فطرت کا ظلم کہکر بھی پوری طرح ظاہر نہیں کرسکتے - رام جنم آوارہ گردی اور جلاوطنی کی زندگی بسر کررہا تھا - اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ کبھی منزل تک پہونچ سکیگا - دل و جگر یونہیں کیا کم زخم خوردہ تھے کہ قدرت نے ایک اور زخم تازہ پیدا کردیا - ایک روز نیند میں رام استیس ماں کی آغوش سے الگ ہوگیا - اتفاقاً ایک سانپ نکلا اور ڈس گیا - رام جنم بے دست و پا تھا - کوئی چارہ نہ تھا - بچہ دم توڑ رہا تھا اور ماں باپ بے بسی کے عالم میں دیکھ رہے تھے - رام جنم کیا کرسکتا تھا - وہ جگہ آبادی سے کوسوں دور تھی - بالآخر اپنے جگر کے ٹکڑے کو ایک کثیف اور پھٹے ہوئے کپڑے کے ٹکڑے میں لپیٹ کر اسی جگہ ایک گڑھے میں ڈال دیا -

اسی طرح مصیبت کے دن اور تکلیف کی راتیں بسر کرتے ہوئے رام جنم اور منی کلکتہ پہونچے - انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں ٹھہریں - آخر کسی سے پوچھکر ایک مارواڑی کے دھرم شالہ میں جا ٹھہرے - رام جنم کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ یہاں غریبوں کو کھانا بھی مفت دیا جاتا ہے -

تقریباً ایک ہفتہ اس نے خاموشی سے گزار دیا - لیکن اب اسے فکر ہونے لگی کہ اپنے لئے وجہ معاش تلاش کرے - مفت کی روٹیوں پر کب تک بسر کریگا - بہت دوڑ دھوپ کی لیکن سب بیکار - اسے ہر طرف سے مایوسی ہوگئی - آخر اس کے ذہن میں ایک بات آئی - منی کے روپے کے کڑے جو اس کے جسم کے آخری زیور تھے فروخت کردئے اور ان روپیوں سے پھلوں کی تجارت شروع کردی - دوکانداروں سے پھل خریدتا اور پھیری کرکے بیچ لاتا - شدہ شدہ اس کی ایمانداری سے دوکاندار بھی واقف ہوتے گئے اور اب اسے نقد اودھار سب ملنے لگا - اب وہ زیادہ مقدار میں پھل خریدتا اور فروخت کرتا - اسے اتنا نفع ہونے لگا کہ اس میں سے کچھ پیسے پس انداز بھی کرلیتا

رام جنم نے ایک کوٹھری کرایہ پر لے رکھی تھی اور اب وہ بے فکر زندگی بسر کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ جب اسکے پاس کچھ روپئے جمع ہو گئے تو وہ ایک دوکان کرایہ پر لے کر بیٹھ گیا۔

(۴)

زمانہ بقدر دس سال آگے بڑھ چکا ہے اور اس عرصہ میں خدا جانے کتنے انقلابات دنیا میں رونما ہوئے، بابو راجگوپال سنگھ کے یہاں شادی ہو چکی ہے، اور ایسی شادی کہ آس پاس کے رہنے والوں نے کبھی ایسی دھوم دھام نہیں دیکھی تھی۔ رام جنم سنگھ کا تذکرہ کچھ روز تو لوگوں کی زبان پر رہا لیکن کب تک، ممکن ہے لوگوں کے دماغ سے اب بھی اسکی تصویر فنا نہ ہوئی ہو لیکن انھیں کیا ضرورت تھی کہ وہ اس کا تذکرہ کرتے ــــ ایک غریب کے وجود کو اتنی اہمیت حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔

رام جنم اپنی تجارت میں برابر ترقی کر رہا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کلکتہ کے پھل کے تاجروں میں عزت کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور اب وہ ایک بڑی آڑھت کا مالک ہو گیا۔ آمدنی کافی تھی۔ روپئے خوب جمع ہوتے رہے اگر اسوقت وہ اپنے گاؤں میں ہوتا تو امیر سمجھا جاتا اور بابو صاحب بھی اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

رام جنم جب رات کو آڑھت سے واپس آتا تو اکثر منی کے ساتھ بیٹھکر اپنے گزشتہ ایام پر تبصرہ کرتا۔ گاؤں کے ایک ایک فرد کا نام لیکر ان کے متعلق قیاس آرائیاں کرتا۔ کبھی کہتا کلیشور سنگھ یاد ہے منی! اس نے اپنے پوتے کی برہی میں کیسی دھوم دھام کی تھی۔ کتنے برہمن آئے تھے۔ بھائی بندوں کو بھی خوب کھلایا تھا۔ اب تو اس کے کتنے پوتے پوتیاں ہو چکی ہوں گی اب بھی جب بابو صاحب کا نام آتا تو ایک سرد آہ کھینچتا اور آنکھ سے آنسو ٹپک پڑتے۔

منی سمجھاتی کہ کیوں فکر کرتے ہو جو ہونا تھا ہو چکا۔ سوچو تو اگر بابو صاحب ایسا نہ کرتے تو ہم لوگوں کو کبھی اطمینان نصیب ہو سکتا تھا؟ ایشور کو دینا تھا اس لئے بابو صاحب کو اس کا ذریعہ بنا دیا۔ تم اسے ظلم کہتے ہو لیکن اب تو میں اسے ان کا احسان سمجھتی ہوں۔ اور اگر میرا بس چلتا تو اس احسان کا بدلہ اُتارتی میرا بہت جی چاہتا ہے کہ اپنے گاؤں میں جاکر لوگوں سے مل آتی۔ زندگی موت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ دیومتی کو دیکھے ہوئے کتنے برس گزر گئے۔ اسے بھی سسرال سے بلوا کر دیکھ لیتی۔

رام جنم۔ اگر تمھاری یہ خواہش ہے تو کون منع کرتا ہے۔ چلو میرا بھی جی چاہتا ہے۔

رام جنم نے دوسرے ہی روز جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ گاؤں کے ایک ایک فرد کے لئے تحفے خریدے گئے۔ بسکٹ، ناریل کا تیل، اور کھجور تو کثیر مقدار میں تھی۔ کلکتہ کے یہ تحفے دیہاتیوں میں بہت مقبول ہیں۔ بابو صاحب کے لئے ایک گھڑی اور ایک خوبصورت چھتری خریدی گئی۔

(۵)

رام جنم دس برس کے بعد وطن واپس آرہا تھا۔ راستہ میں گاؤں کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا جاتا تھا۔ بابو صاحب کا مکان بھی راستہ ہی میں پڑتا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی عجیب حالت ہوگئی۔ چاروں طرف وہ سناٹا تھا گھبرا گیا گاؤں میں پہونچا تو ایک ہنگامہ مچ گیا۔ بچے بوڑھے، جوان سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ عورتیں دروازوں سے جھانک جھانک دیکھ رہی تھیں اور اس کی شان و شوکت کو دیکھ کر تعجب کر رہی تھیں۔ رام جنم نے بابو صاحب کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ساری جائداد ہاتھ سے جاتی رہی اور اب وہ بالکل مفلس ہو کر رہ گئے ہیں سیٹھ بھگوانداس نے روپیوں کی نالش کردی اور پوری جائداد نیلام پر چڑھ گئی۔ بابو صاحب بہت دوڑے دھوپے لیکن کوئی سبیل روپیوں کی نہ ہوسکی۔ اپنے سمدھی سے التجا کی لیکن وہاں سے بھی صاف جواب ملا۔ کلکٹر صاحب نے ایک ماہ کی اور مہلت دی اور اب حالت یہ ہے کہ بابو صاحب ایک ہفتہ سے گھر میں بند ہیں، باہر انھیں کوئی نہیں دیکھتا۔

رام جنم نے سارے واقعات سنے اور دانت کے نیچے انگلی دبا کر رہ گیا۔ اسے متی کے الفاظ یاد آرہے تھے "اگر میرا بس چلتا تو احسان کا بدلہ اتارتی"۔ دوسرے روز علی الصباح اٹھا اور سیدھا پٹنہ پہونچا۔ پوری کی پوری رقم مطلوبہ خزانہ میں داخل کردی۔ سیٹھ بھگوان داس سے بھی ملا۔ پھر ضروری کاغذات لیکر وہاں سے روانہ ہوا کہ گاؤں میں پہونچکر بابو صاحب کے حوالے کردے۔ لیکن جب گاؤں کے کنارے پہونچا تو دیکھا کہ لوگ ایک لاش اٹھائے مرگھٹ کی طرف جارہے ہیں ــــ ذلت اور رسوائی کے خوف سے بابو صاحب نے خودکشی کرلی تھی۔

الیاس اسلام پوری

"نگار" جنوری ۳۷ء

اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل جدید چیز ہوگا اور مفید ہونے کی حیثیت سے حد درجہ اہم۔ علوم و فنون اور ادب و انشاء کے متعلق اتنے مفید اور دلکش مضامین کا مجموعہ مشکل ہی سے آپ کو کہیں اور نظر آسکتا ہے۔

"ڈرامہ اصحاب کہف"

بھی مکمل اسی میں شائع ہوگا اور علاوہ اس کے اور بھی اکثر مضامین اڈیٹر کے قلم کے ہوں گے۔ ضخامت بھی دو چند ہوگی۔

منیجر نگار۔ لکھنو

حیات بعد الموت

"حیات بعد الموت" ابتدائے آفرینش سے ایک ایسا معمہ ہے جس کو حل کرنے کے لئے بنی آدم کے بہترین دماغ مدت العمر تک پریشان رہے مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ انسان کو اپنی حیات سے بہت محبت ہے اور اس کے تلف ہونے کے خیال سے وہ ایسا پژمردہ اور نڈھال ہو جاتا ہے کہ دیکھکر افسوس بھی ہوتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔ فطرت کی یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ اس نے انسان کو اسی چیز سے حد درجہ محبت کرنا سکھایا جسکی پائداری پر خود اس کو اعتبار نہیں۔ موت کے صرف خیال سے انسان پریشان ہو جاتا ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے، موت آتی ہے اور ضرور آتی ہے اور مرنے والے کی تمام حسرتوں اور ارمانوں کا چشم زدن میں خاتمہ کر دیتی ہے۔ سب سے پہلے انسان جس نے اپنے محبوب کو مرتے دیکھا ہوگا وہ اس انقلاب پر کتنا متعجب ہوا ہوگا اور اس واقعہ کا ذکر اس نے کتنی حیرت و حسرت سے کیا ہوگا کہ مرنے والا دفعتاً خاموش ہوگیا ہے حالانکہ اس کی زبان موجود ہے۔ مرنے والا کچھ دیکھ نہیں سکتا حالانکہ اس کی آنکھیں موجود ہیں الغرض وہ سرتاپا مکمل انسان ہے مگر پھر بھی انسان نہیں۔

اسی طرح پشت در پشت موت اپنا قبضہ جماتی رہی اور یکے بعد دیگرے انسان مرتے رہے۔ موت کے بعد کا معمہ بدستور معمہ بنا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ انسان کے درمیان بانیان مذہب آئے اور انھوں نے یہ دیکھ کر کہ انسان موت کے بعد کی حالت جاننے کے لئے بیقرار ہے۔ موت کے بعد حیات کا یقین انسان کو کچھ اس شد و مد سے دلایا کہ اسنے فوراً اس کا یقین کر لیا۔ تاریخ عالم کے صفحات شاہد ہیں کہ سادہ لوح انسان نے اس نظریہ پر کس طرح یقین کیا اور حیات بعد الموت کے مزے چکھنے کے لئے اس حیات قبل از موت کو کیونکر ٹھکرا دیا۔ ایک رات کی بیاہی ہوئی دلہن کے ارمان اور ولولے بھرے ہوئے دل کو پہلو سے جدا کر کے دولہا نے شوق شہادت میں تلوار لی ہے اور انسان کے مقدس خون کو بہانے کی فکر میں خود اپنی گردن کٹو بیٹھا ہے تاکہ مرنے کے بعد حیات دائمی حاصل کرے اور "وہاں" کی مسرتوں سے لطف اندوز ہو۔

اب آیئے ذرا دیکھیں کہ انسانیت نے عہد طفلی سے لیکر آج تک "حیات بعد الموت" کو کس کس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ انسان کا جسم مرنے کے بعد چونکہ سڑ جاتا ہے اور اس کی ہیئت اس قابل نہیں رہتی کہ کوئی

آدمی اس صورت میں جینا پسند کرے اس لئے جوہر حیات یا روح کو وجود میں لانا پڑا یعنی جسم کے ماسوا بھی انسان کے اندر ایسا جوہر موجود ہے جو روح ہے اور اس میں حیات ہے۔ روح بھی لطائف زندگی سے اسی طرح محفوظ ہو سکتی ہے جس طرح ایک گوشت پوست والا انسان - مذہب نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہمارا کبھی نہ فنا ہونے والا جوہر یعنی روح مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور یہ ایک نہ ایک دن ہمارے مردہ اجسام میں پھر آکر پیوست ہو جائے گا اور ہمیں زندہ کر دے گا۔ اس نظریہ کے لئے ضرورت پڑی کہ انسان کے جسم کو مرنے کے بعد برباد نہ کیا جائے بلکہ محفوظ رکھا جائے مردہ جسم کو محفوظ رکھنے کے لئے صدیوں تک انسان نے انتھک کوششیں کیں اور اس علم کو انتہائے کمال تک پہونچا دیا جس کی مثال ہم مصر کی ممی شدہ لاشوں میں پاتے ہیں۔ اہرام مصری میں لاش کے ساتھ ساتھ ہم تمام ان ضروریات زندگی کی چیزوں کو پاتے ہیں جن کی ضرورت انسان کو دفعتاً جی اُٹھنے کے بعد پڑ سکتی ہے مثلاً کھانا، بستر، کپڑا، زیور وغیرہ۔ اہرام مصری کے یہ لوازم گویا مذہب کے اس نظریہ کا بہترین ثبوت ہیں کہ مرا ہوا انسان ایک روز زندہ ہوگا اور وہ پھر ہماری طرح زندگی بسر کریگا۔ پارسیوں کا اپنی لاشوں کو ایک محفوظ مقام میں رکھ چھوڑنا بھی اسی خیال سے ہے کہ ایک روز روح آئے گی اور مردہ جسم میں داخل ہو کر مرے ہوئے انسان کو جلا دے گی۔

انسانی دماغ کچھ اور بڑھا اور مذکورہ بالا نظریہ اس کو مہمل سا معلوم ہونے لگا۔ اس میں سزا و جزا کی گنجائش نہ تھی مرنے کے بعد جو انسان جس حیثیت میں مرا تھا پھر زندہ ہونے کے بعد اس کی وہی حیثیت قائم رہتی تھی اسلئے اس دفعہ مذہب نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مرنے کے بعد روح زندہ تو ضرور رہتی ہے مگر یہ لازم نہیں کہ وہ اپنے سابق جسم ہی میں واپس آئے۔ اگر وہ گناہگار ہے تو اس کی روح گدھے، گھوڑے وغیرہ کے جسم میں لوٹ کر آئے گی اور اگر نیک ہے تو بادشاہ یا سپہ سالار کی صورت میں۔ چنانچہ یہ عقیدہ ہندوں میں ابتک پایا جاتا ہے۔ اب جبکہ روح کو جسم کی ضرورت باقی نہ رہی تو مردہ جسم کو جلایا جانے لگا جو لاشہ کو برباد کرنے کی، حفظان صحت کے نقطۂ خیال سے بہترین صورت ہے۔

مذاہب عالم نے حیات بعد الموت کو سمجھانے کی جو کوششیں کی ہیں وہ انسانی کم عقلی کے عجیب و غریب کارنامے ہیں۔ لاشہ کو سجا کر پیجانا، مرنے کے بعد لاشہ کے پاس بیٹھ کر گانا، لاشہ کو گاؤں کے باہر لٹکا دینا اور اس کی گرد جمع ہو کر صبح شام دعائیں مانگنا کہ روٹھی ہوئی روح واپس آجائے، لاشہ کو کھانے کی میز پر بٹھا کر اسکی انگلیوں کو نہایت لذیذ کھانوں میں ڈبو دینا اور اس کو دکھا کر کھانا تاکہ گئی ہوئی روح کھانے کی لالچ سے واپس آجائے۔ لاشہ کی صورت کا بت بنا کر پوجنا۔ الغرض اس طرح کی مضحکہ خیز سینکڑوں ترکیبیں مذاہب نے نکالیں جو آج تو اب و خ بہ یہ کے اوراق کو زیب دیتی ہیں یا ان کو دیکھ کر عقل سلیم کا انسان ہنس دیتا ہے اور اپنی ضعیف الاعتقادی

پر شرمندہ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کی یہ سب سے بڑی ٹریجڈی ہے کہ انسان اپنی مرضی کے خلاف ایک نہ ایک دن مرجاتا ہے اور اپنے ساتھ ناتمام حسرتوں کو لیکر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی اس مجبوری پر جلتا ہے سیکڑوں سال تک خون کے آنسو روتا رہے مگر یہ اختتام یقینی ہے اور اس سے مفر نہیں۔

ابتک میں نے جو کچھ اس مسئلہ پر لکھا ہے وہ علمی حیثیت سے بہت دور صرف مذہب کے مفروضات سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ ہر انسان کو مرنا ضرور ہے اس لئے اس مسئلہ پر سوچنا اور اپنی سمجھ بھر کسی نقطہ پر آکر اپنی تشفی کر لینا اس کا پیدائشی حق ہے۔ ہمارے ساتھ ساتھ دنیا میں اور بھی ذی حیات چیزیں ہیں جن میں حس حیات اسی حد تک موجود ہے جتنی ہم میں مثلاً حیوانات، نباتات وغیرہ۔ ایک مرغ کو لیجئے، انسان کی طرح حیات و حواس خمسہ اس میں بھی موجود ہیں۔ وہ صنف نازک کی طرف اسی رغبت سے ملتفت ہوتا ہے جس طرح ایک جوان مرد جوان عورت کی طرف۔ وہ بانگ دیتا ہے۔ بلّی کی آواز سنکر کٹکٹاتا ہے۔ چاول دیکھ کر کھانے کو دوڑتا ہے اس کے پروں کو چھو دیجئے تو وہ چونک اٹھتا ہے۔ اس کو ذبح کرنے کے لئے پکڑنا چاہئے تو اسی شد ومد سے اپنی جان بچانے کی کوشش کرتا ہے جس طرح ایک انسان مردم خور انسان یا شیر سے اپنی جان بچانے کو بھاگتا ہے ہم اس کو ذبح کرکے کباب کرتے ہیں اور کھا جاتے ہیں۔ کبھی بھول کر ڈکار لیتے وقت مرحوم مرغ کی خوبصورت پروں یا اس کی صبح کی خوش الحانی یا اذان پر دو جملے تعزیت کے بھی نہیں کہتے۔ یہ کیوں؟ چونکہ وہ مرغ ہے۔ انسان نہیں حیات بعدالموت پر اس کو کوئی اختیار نہیں۔ یہ حیات اور لطف حیات تو انسان کی چیز ہے۔ وہ اس دنیا میں بھی لطف اٹھاتا ہے اور مرنے کے بعد بھی ایک دنیا قائم کرکے اس میں زندہ رہنا چاہتا ہے اور وہی لطف اٹھانا چاہتا ہے۔ اگر حیات بعدالموت انسان کے لئے ہے تو دنیا کی تمام ذی روح چیزوں کے لئے بھی ہوگی، اور حیوانات، نباتات وغیرہ بھی مرنے کے بعد زندہ ہوں گے۔ اس لحاظ سے ہر درخت جو کٹ کر فنا ہو چکا ہے وہ پھر اپنی جلی ہوئی لکڑیوں کو ایک جا کرکے زندہ ہوگا اور پھر اسی طرح سرسبز و شاداب ہوگا جیسا کہ جلنے کے قبل تھا صرف یہ خیال کہ جلکر راکھ ہو چکنے والا درخت بھی پھر سرسبز و شاداب ہوگا ایک حیات بعدالموت پر عقیدہ رکھنے والے انسان کے لئے کتنا مضحکہ خیز ہے۔

انسان مجموعہ ہے حواس خمسہ کا، دل کی حرکت اور صدر کے پھولنے اور پچکنے کا۔ یہ تمام چیزیں یا عناصر ایک خاص طرح ترکیب پاتی ہیں تو حیات بنتی ہے۔ پھر یہی اجزا کی ترکیب جب پریشان ہو جاتی ہے تو موت آتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آپریشن کی میز پر مریضوں کو کلوروفارم سنگھا کر بیہوش کر دیتے ہیں۔ انسان بے ہوش ہو جاتا ہے مگر اس کے دل اور صدر کام کرتے رہتے ہیں ہیں حالانکہ بادی النظر میں وہ مردہ ہے مگر ایک عالم یہ کہیگا کہ وہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ گویا ہماری حیات یا جان منحصر ہے صرف اسی چیز پر جس کو دل کی حرکت اور سانس کا لینا

کہتے ہیں۔ میرے ساتھ اکثر یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ مریض آپریشن ٹیبل پر گیا اور اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی
میری میز پر زیادہ سے زیادہ ایک منٹ ۵۵ سکنڈ تک ایک انسان اس حالت میں مردہ پڑا رہا ہے یعنی اسکی
سانس رُک گئی ہونٹ نیلے ہو گئے، آنکھیں پتھرا گئیں، الغرض وہ تمام نشانات اُبھر آئے جو مرنے کے بعد ظاہر
ہوتے ہیں۔ بڑی کاوشوں کے بعد جان لوٹی یعنی دل چلنے لگا اور سانس بھی۔ کچھ دیر کے بعد ہوش آیا۔ میں نے
بڑی بے تابی سے پوچھا کہ اُس نے اس دوران میں کیا محسوس کیا۔ مریض نے کہا "کچھ بھی نہیں۔ مجھے کوئی خبر
نہیں کہ کیا ہوا۔ میں کہاں ہوں اور کیا ہوں، میرے تمام احساس مفقود تھے۔ میرے وجود کا فقدان تھا۔
گویا میں کچھ تھا ہی نہیں" اس مریض سے اس ایک منٹ ۵۵ سکنڈ کے متعلق پوچھنا ایسا ہی تھا جیسے کسی
مردہ کو قبر سے اُٹھا کر وہاں کی حالت دریافت کرنا۔ آپریشن ٹیبل پر مرنے کا واقعہ اکثر ڈاکٹروں کو پیش آیا ہے بلکہ
حال ہی میں ایک شخص کی جان دس منٹ کے بعد لوٹی۔ اس سے بھی سوال کیا گیا تو یہی جواب ملا۔ اس قسم کے
واقعات و نیز اس جوگی کا واقعہ جو چالیس دن تک قبر میں گڑا رہا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ موت کے
بعد انسان پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو روزانہ اس کو حالت خواب میں ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ
نیند میں انسان مرتا نہیں بلکہ جیتا رہتا ہے یعنی نیند میں خواب کا دیکھنا مہمل سا عذر ہے حیات بعد الموت
کے لئے۔ انسان کی نیند جب گہری ہو گی تو وہ کبھی خواب نہ دیکھے گا۔ خواب دیکھنا نیند کے ہلکے ہونے کا ثبوت
ہے اور میری مراد ہلکی نیند سے نہیں بلکہ گہری نیند سے ہے۔ عذر لنگ پیش کرنے والے انسان جو مرنے کے بعد بھی
مرنا نہیں چاہتے آپریشن ٹیبل کی موت کو بستر مرگ کی موت سے جدا بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "چونکہ روح کو
خبر تھی کہ مجھے اس خاکی جسم میں لوٹ کر آنا ہے اس لئے وہ جسم سے قطعی نکلی نہیں بلکہ اسی میں رہی۔ اس لئے
وہ روح موت کے بعد والی دنیا کی کیا خبر لا سکتی ہے جو اُس دنیا میں کبھی گئی ہی نہیں۔" یہ عذر کتنا پوچ ہے
—— ان کی دلیل سے روح اور حیات دو چیزیں ہوئیں۔ روح کے وجود کا خود مالک روح کو احساس نہیں۔
روح اور انسان دونوں دو طرح اور دو خیال کی چیزیں ہوئیں یعنی مالک روح کو یہ خبر نہیں کہ یہ کس کی روح
ہے اور روح کو معلوم نہیں کہ میں کس کی ہوں۔ پھر مجھے کوئی یہ بتائے کہ اس حیات کو حیات کیونکر کہا جائے جہاں
جینے والے کو خود یہ خبر نہ ہو کہ میں کون ہوں، میں کیا تھا، میں جی رہا ہوں کہ مر گیا۔ میرے خیال میں زندگی نام ہے
احساس خودی کا، ماحول کی مانوس چیزوں میں رہنے کا اور ان سے لطف اندوز ہونے کا۔ اگر دل اور صدر
کی حرکت کے باوجود ان کیفیات کو کسی انسان سے سلب کر لیجئے تو وہ مردہ ہو جائے گا اگرچہ دیکھنے میں وہ زندہ ہے
اور اسی عالم آب و گل میں مقید ہے۔
ادہ برباد ہونے والی شے نہیں۔ انسان کا جسم بھی مادی ہے۔ مرنے کے بعد وہ تمام قوت جس کو اس نے

اس نے غذا کے ذریعہ سے اپنے جسم میں جمع کیا تھا ضائع نہیں ہوتی بلکہ دوسری صورت اختیار کر لیتی ہے مثلاً اس کے جسم کا سڑ کر نہایت عمدہ کھاد کا تیار ہونا جس سے سیکڑوں طرح کے پھول، اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ سڑتے وقت متعفن گیسوں کا پیدا ہونا جو فضا میں پھیل کر عالم نباتات میں قوت پیدا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ الغرض قوت دوسری چیزوں میں جذب ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ زید مع اپنے تمام احساسات و علم کے کہ میں زید ہوں پھول یا پھل بن جاتا ہے یعنی ایک خاص گلاب کا پھول یہ کبھی محسوس نہیں کرتا کہ میں زید کے جسم سے بنا ہوں یا میں وہی زید ہوں جو بکر کا بیٹا تھا، ملیح آباد میں رہتا تھا اور آموں کی تجارت کرتا تھا۔ زید مرنے کے بعد ختم ہو گیا اور اس کے احساسات وغیرہ اس کے ساتھ فنا ہو گئے۔ اس کی کشمکش حیات وہیں ختم ہو گئی۔ اب یہ فطرت کا کام ہے کہ اس کے جسم سے کیوڑہ اگائے یا اس کی ہڈیوں سے فاسفورس بنائے جس کا احساس زید کو کبھی بھی نہ ہوگا۔

مشاہدہ اور تجربہ کی روشنی میں حیات بعد الموت کی حقیقت "خواب پریشاں" سے زیادہ نہیں رہتی مگر انسان جو صدیوں سے "دین و عقبیٰ" جیسے الفاظ سننے کا عادی ہو چکا ہے وہ بھلا کیونکر ماننے لگا۔ کیونکہ اس جواب میں اس کے مذہبی جوش و خروش کا کوئی معاوضہ نہیں، اس میں اس کی بڑھتی ہوئی حرص کے لئے کوئی توقع موجود نہیں۔ اس میں اسکی موت کی تکلیف و حسرت کا غم کرنے کے لئے دوسری زندگی کا کوئی سامان نہیں۔ مگر آہ! انسان کتنا ذلیل اور طامع ہے۔ کیا اس دنیا کی ساٹھ سال کی ریاکاریوں کے بعد بھی اس کی طبیعت کو تشفی نہیں ہوتی کہ وہ پھر اپنے مکر و فریب کے لئے مرنے کے بعد بھی دوسری دنیا چاہتا ہے؟ موت، قوائے مضمحل کے لئے کبھی نہ ٹوٹنے والی نیند ہے۔ یہ نیند ساٹھ سال کی انتھک اور مسلسل تگ و دو کے بعد کتنی میٹھی اور گہری ہوگی؟ اس نیند سے بھلا کون جاگنا چاہیگا اور دوبارہ زندگی اور آلام زندگی سے اپنے اعصاب کو پراگندہ کرنا چاہیگا؟ مجھے اس کا یقین ہے کہ اس نیند کا ایک بار مزہ چکھنے کے بعد کوئی بھی ایسا نہ چاہے گا کہ پھر وہ جاگے اور دوڑ دھوپ کرے۔

سقراط نے سچ کہا ہے کہ "موت کی تلخی صرف اس کے خیال میں ہے"

محمد نصیر الدین ایم۔ بی۔ بی۔ اس (آنرز)، مونگیر

اگر آپ "ہندی شاعری" پر سیر حاصل تاریخی و تنقیدی مقالات اور اُس کا انتخاب دیکھنا چاہتے ہیں تو نگار جنوری ۳۶ء ملاحظہ فرمائیے۔ حجم ۱۶۸ صفحات قیمت ۸/ علاوہ محصول۔　　منیجر نگار۔ لکھنؤ

گاندھی جی کی نئی بانی

ذیل میں گاندھی جی کا وہ خطبہ درج کیا جاتا ہے جو بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے صدر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے ناگپور میں پڑھا تھا۔

اگر قارئین نگار میں سے کوئی صاحب اس کو سمجھ لیں تو اس کی ذمہ داری گاندھی جی کے سر نہیں ہے بلکہ وہی اس کے جوابدہ ہیں، کیونکہ لکھنے والے کا مقصود تو یہی تھا کہ کوئی مسلمان اسے صحیح پڑھ بھی نہ سکے، سمجھنے کا کیا ذکر ہے۔

یہ ہے وہ زبان جسے ہندوستان کی مشترکہ زبان سمجھنے پر اصرار کیا جاتا ہے اور یہ ہے وہ لٹریچر جسے "سخن گسترانہ" طور پر غالب کے جواب میں بجائے نظم کے نثر میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مرزا نوشہ اگر آج زندہ ہوتے تو وہی پوچھ سکتے تھے کہ " یہ انداز گفتگو کیا ہے"۔ ہم اس کے اعتراف میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ بیشک عربی فارسی کے الفاظ قابل ترک ہیں اور یہ "دیو بانی" لایق احترام۔

ہمارے عزیز دوست میاں بشیر احمد بی۔اے اور زبان کو سہل تر بنانے کے سلسلہ میں اسی قسم کا شورہ دینے والے دوسرے حضرات انشاء کے اس جدید نمونہ کو دیکھ کر غالباً بہت خوش ہوں گے کیونکہ "عربی فارسی الفاظ!" ترک کر کے ایک دوسرے سے بات کرنے کی مثال شاید ہی اس سے بہتر کوئی اور مل سکے!

(نیاز)

اس سبھا کا سبھا پتیتو مجھے دینے کے کارن جب میں ڈھونڈھتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دویش کا کارن ہونا تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بہو شیمہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھا دیں گے۔۔

یدی ہم شری نگر سے لے کر کنیا کماری تک اور کراچی سے لے کر ڈبرو گڑھ تک جو یہ دیش ہیں اسے ایک مانتے ہیں

اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار، بھاشا شاستری اِتیادی آپس میں کیول نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی تھایوگیہ سیوا کیوں نہ کریں۔

گجراتی اپنے پڑوسی مہاراشٹری کی بھاشا جاننے کا بھی پریتن کرتے دیکھنے میں نہیں آتے ہیں۔ ہندی جاننے والے بھی اُردو لیپی سیکھنے کا کشٹ کم اُٹھاتے ہیں۔ اُردو جاننے والے مسلمان کوچت ہی دیوناگری لیپی پڑھنے کا اتھوا ہندی میں پرچلت سنسکرت شبدوں کے ارتھ جاننے کا کشٹ اُٹھاتے ہیں۔ کہیں بھی دیکھیں وستو ستھیتی ایسی دیاجنک ہے۔ کسی کے دوش نکالنے کا یہ ستھان نہیں ہے۔ دوش درشن میں ہمیں کچھ لابھ ہو سکتا نہیں وستو ستھیتی جان کر اسے یتھا سمبھو مٹانے کے لئے ہی ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔

وِدوان لوگ ایک دوسرے کے ساہتیہ کا کچھ گیان پاویں۔ اتنے ہی سے ہمیں سنتوش ہونے کا نہیں ہے۔ ہمیں تو دیہاتی ساہتیہ کی بھی درکار ہے اور دیہاتیوں میں آدھونک ساہتیہ کے پرچار کی۔ شرم کی بات ہے کہ چیتنیا کی پرسادی بھارت ورش کے سارے بھاشا بھاشیوں کو اپراپیہ ہے ترودیلود۔ کا نام تک شاید ہم سب نہیں جانتے ہوں گے۔ اتر بھارت کی جنتا تو اس سنت لوگ کرسکے ہیں۔ اس بارے میں اس وقت تو تو کارام ہی دوسرا نام میرے خیال میں آتا ہے۔

اگر ہم سارے ہندوستان کے ساہتیہ کے وشال کشیتر میں پردیش کریں تو کیا اس کی کچھ سیما مریادا ہونی چاہئے۔ میری درشٹی میں تو اوشیے ہونی چاہئے۔ مجھے پستکوں کی سنکھیا بڑھانے کا موہ کبھی نہیں رہا ہے۔ پرتیک پرانت کی بھاشا میں لکھی اور چھپی پرتیک پستک کا پرچے دوسری سب بھاشاؤں میں ہونا میں آوشیک نہیں مانتا ہوں۔ ایسا پریتن یدی سمبھو بھی ہو تو اسے میں ہانی کار سمجھتا ہوں۔ جو ساہتیہ ایکتا کا، نیتی کا، شوریادی گنوں کا، وگیان کا پوشک ہے اس کا پرچار پرتیک پرانت میں ہونا آوشیک اور لابھ دایک ہے۔

آج کل شرنگار رکیت اشلیل ساہتیہ کی باڑھ سب پرانتوں میں آرہی ہے۔ کوئی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ایک شرنگار کو چھوڑ کر اور کوئی رس ہے ہی نہیں۔ شرنگار رس کو بڑھانے کے کارن ایسے سجن دوسروں کو "تیاگی" کر کران کی اُپیکشا اور اُپہاس کرتے ہیں۔ جو سب چیزوں کا تیاگ کر بیٹھتے ہیں وے بھی رس کا تو تیاگ نہیں کرپاتے کسی نہ کسی پرکار کے رس سے ہم سب بھرے ہیں۔ دادا بھائی نوروجی نے دیش کے لئے سب کچھ چھوڑ رکھا تھا۔ وے تو بڑے رسک تھے۔ دیش سیوا ہی انھوں نے اپنا رس بنا رکھا تھا۔ اسی میں انھیں پرسنتا ملتی تھی۔ چیتنیا کو رہین کہنا رس کو ہی نہیں جاننا ہے۔ نرسنگھ مہتا نے اپنے کو بھوگی بتایا ہے۔ یدیاپی وے گجرات کے بھگت شرومنی تھے آپ نہ اکھرے تو میں تو یہاں تک کہوں گا کہ میں شرنگار رس کو تچھ رس سمجھتا ہوں جب اس میں اشلیلتا آتی ہے تب اسے سروتھا تیاجیا مانتا ہوں۔ یدی میری چلے تو میں اس سنستھا میں ایسے رس کو تیاجیہ منوا دوں۔ اسی طرح

قومی بھیدوں کو دھرم اندھتا کو تتھا پر جائیں اتھوا دیکتیوں ہیں وے منسیہ کو جو ساہتیہ بڑھاتا ہے اس کا بھی تیاگ ہونا آوشیک ہے۔

یہ کاریہ کیسے کیا جائے ؟ منشی جی اور کاکا صاحب نے ہمارا مارگ ایک حد تک صاف کر رکھا ہے۔ ویاپک ساہتیہ کا پرچار ویاپک بھاشا میں ہی ہو سکتا ہے۔ ایسی بھاشا اینہ بھاشا کی اپیکشا ہندی ہندوستانی ہی ہے ہندی کو ہندوستانی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بھاشا میں فارسی محاورے کے شبدوں کا تیاگ نہ کیا جائے۔

انگریزی بھاشا کبھی سب پرانتوں کے لئے واہن (یا مادھیم) نہیں ہو سکتی یدی ہم سچ مچ ہندوستان کے ساہتیہ کی وردھی چاہتے ہیں بھن بھن بھاشاؤں میں جو رتن چھپے پڑے ہیں ان کا پرچار بھارت ورش کے کروڑوں نشیوں میں کرنا چاہتے ہیں تو ہم ہندوستانی کی معرفت ہی کر سکتے ہیں۔ اسی درشٹی سے منشی جی نے پرسدھ لیکھک پریم چند جی کی سہایتا سے ماسک "ہنس" نکالا ہے اسے سمردھ بنانے کی آوشیکتا ہے۔

میں نے تھوڑا ہی سے نکال کر اپنا ابھی پرایہ سنکشیپ میں بتایا ہے۔ سچا ابھی پرایہ تو یہاں جو ساہتیہ اچاریہ آئے ہیں۔ ان کا ہی ہو سکتا ہے۔ یدی آج کی سبھا کو ایک استھائی سنستھا میں پری نت ہونا ہے تو ساہتیہ اچاریوں کے دوارا ہی ہو سکتی ہے۔

شاعروں اور ادیبوں سے

حضرت محمود بریلوی جو نہایت خوش فکر صاحب قلم ہیں عرصہ سے "اُردو ادب" کی ایک جامع تاریخ مرتب فرما رہے ہیں اور اس کا ایک بڑا حصہ مکمل بھی کر چکے ہیں۔ لیکن عنوات ذیل ابھی تک زیر ترتیب ہیں:۔

(۱) زمانۂ حال کے شعراء و ادباء — (۲) اُردو کی سخنگو و انشا پرداز خواتین۔

اس لئے تمام شاعروں، ادیبوں اور سخنگو خواتین سے درخواست کیجاتی ہے کہ وہ اپنے تمام حالات معہ نمونۂ نظم و نثر صاحب موصوف کے پاس بھیجدیں اور ان کے حلقۂ احباب میں جو حضرات شاعر و ادیب ہیں ان کو بھی اس طرف متوجہ فرمائیں — جناب محمود بریلوی کا پتہ یہ ہے:۔

B. I. T. Block

8/14 Ibrahim Rahmatullah Road

BOMBAY-3

مکتوبات نیاز

مجھے ستاکر خوش ہونے والے!

لکھنؤ کا ایک مشہور شاعر اپنے محبوب کو دلآزاریوں سے باز رکھنے کے لئے ڈراتا ہے کہ "روز محشر قریب ہے اس لئے اگر تم نے عشاق کا خون بہایا تو بڑی مصیبت میں پڑ جاؤ گے کیونکہ اگر تمہارے خنجر نے تمہارے خلاف شہادت نہ دی تو بھی اس کا کیا علاج کہ —— لہو پکاریگا آستیں کا ——"

اگر میں شاعر ہوتا تو ممکن ہے تمہاری ستم رانیوں سے بچ جاتا اگر میں بھی تمھیں خدا اور رسول سے ڈرانے کی کوشش کرتا۔ حالانکہ تم ایسے دشمنِ دین و ایماں ہو کہ یوں بھی نہ ڈرتے۔ لیکن بدقسمتی سے "عاشقِ غیر شاعر" ہوں اور باوجود اس کے کہ ہمیشہ "ستمِ تازہ" کا شکار رہتا ہوں زبان سے یہی نکلتا ہے کہ

گرچہ میدانم نگاہت فتنہ است ا امخوا ہے

خیر یہ تو میں نے اس لئے کہدیا کہ ایسی باتوں سے تم خوش ہوتے ہو۔ لیکن سچ بتاؤ میری تمہاری یہ لاگ ڈانٹ کب تک قایم رہیگی۔ میں اگر تمہاری خاطر سے لاکھ بار دن کو رات کہدیتا ہوں تو کیا حرج ہے اگر ایکبار تم میری "بندگی دیرینہ" کا لحاظ کرکے دن کو دن کہدو۔

میں نے تمہیں وہاں جانے سے اس لئے باز نہیں رکھا تھا کہ تمھیں تکلیف ہوگی بلکہ صرف اس لئے کہ نہیں ہوگی۔ اب تم مجھ کو یہ خبر سناتے ہو گویا طعن کرتے ہو کہ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ بالکل لغو ولایعنی تھا۔

پہلے تو میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ تمہاری طبیعت میں صرف ضد ہے، خود بری نہیں لیکن اب پتہ چلا کہ تم بدخو بھی ہو اور بے حس بھی۔ باوجود بیکسی و بیچارگی کے ان کی وسعتِ ظرف کا حال تو مجھے معلوم تھا۔ لیکن تمہارے متعلق یہ بالکل پہلی مرتبہ علم ہوا ہے کہ صرف دل ہی نہیں بلکہ آنکھیں بھی پتھرائی ہوئی رکھتے ہو۔

اب دیکھتا ہوں کہ اس احسان سے سبکدوش ہونے کے لئے تم کیا کرتے ہو۔ کروگے کیا —— جانتا ہوں کہ شکریہ کا رسمی خط بھی نہ بھیجوگے۔ ازلی شقی ٹھہرے نا!

میرے کرمفرما،

آپ مجھے یاد فرمائیں اور میں حاضری میں پس و پیش کروں! یہ آپ نے کیا فرمایا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ

بیدست وپا بھی ہوں اور بے زبان بھی۔ یعنی اگر حاضری سے مجبور ہوں تو میں اس کی تفصیل آپ سے کبھی بیان کرنے کا نہیں اور ظاہر ہے کہ بغیر کہے آپ کو کیا معلوم ہو سکتا ہے۔

بہرحال میں نے جو عذر پیش کیا وہ جناب کے سرِ عزیز کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ رسمی ولایعنی نہ تھا۔ دل کے داغ کہیں چھپائے چھپ سکتے ہیں۔ آپ دور ہیں اس لئے ایسا فرماتے ہیں، یہاں آ کر دیکھئے کہ اس لالہ زار کی بہار کا کیا عالم ہے۔

اگر سوال میری موت و زندگی کا ہوتا تو بھی میں اس کی پرواہ نہ کرتا، بیماری یا نقاہت کیا چیز ہے، لیکن آپ ہی بتایئے کہ مقطع ہیں کوئی "سخن گسترانہ" بات آ پڑے تو کیا کیا جائے۔ بہرحال ابھی چند دن تک تو حاضری ممکن نہیں، لیکن "قمر در عقرب" کسی نہ کسی دن آخر ختم ہی ہوگا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ "داستانِ پرافشانی" سنانے آپ کے حضور نہ آؤں گا تو کیا دیوبند کے کسی مولوی کے پاس جاؤں گا۔۔۔ پیرِ درماندہ۔۔۔!

بندہ نواز،

نوازش نامہ ملا۔ پڑھ کر بہت لطف آیا۔ کیا کہوں کہ حضرت نے کیا کیا حکمتیں ارزانی فرمائی ہیں۔ عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حکمۃ مومن کا کھویا ہوا مال ہے، جہاں ملے اس پر قبضہ کرلو" اس لئے اگر عمل کی توفیق نہ ہوئی تو کیا انھیں سنوں گا بھی نہیں۔۔۔ سنوں گا چاہے کلیجہ خون ہی کیوں نہ ہو جائے۔

میرے عزیز دوست، میں نے تو خیر سُن لیا جو آپ نے فرمایا، لیکن آئندہ اس کا خیال رکھئے کہ جو لوگ "مشربِ پروانہ" رکھتے ہیں ان کے سامنے "افسانۂ طور وکلیم" دُہرانا کوئی معقول بات نہیں۔ آپ کو تو بہار پیدا کرنے کے لئے کوثر و سلسبیل، طوبیٰ و فردوس، حور و قصور اور خدا جانے کس کس چیز کا اہتمام کرنا پڑتا ہے اور یہاں تمام کائنات کی رنگینی بہار حاصل کرنے کے لئے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتا کہ

خونے بہ جگر جمع کن و رنگ، بروں آ

اللہ، اللہ کیجئے، آپ بھی کس خبط میں مبتلا ہیں۔ کام کیجئے اور نتیجہ کو کارساز پر چھوڑئے۔ زندگی ہو یا موت، زمین سے ہمارا تعلق چند گز سے زیادہ کا نہیں، اس سے آگے پاؤں پھیلانا دوسرے کا "حق ہمسایگی" غصب کرنا ہے۔ "زندہ رہنا اور دوسروں کو زندہ رہنے دینا"، یہ ہے اصل بنیاد عمران و تمدن کی۔ اس اصول سے ہٹ کر آپ سرمایہ دار بن سکتے ہیں، پیرِ خانقاہ ہو سکتے ہیں، دیوبند اور ندوۃ العلماء کے ناظم و مدرس ہو سکتے ہیں، لیکن انسان بننا مشکل ہے۔

آخرت اگر اس دنیا کے علاوہ کسی اور عالم سے متعلق ہے تو وہ مجہول و غیر معلوم ہے، اس کی فکر میں

دنیا خراب کرنا، عاقبت خراب کرنا ہے ۔ اگر خدا کا وجود محبت کی دنیا سے علٰحدہ ہٹ کر کہیں اور پایا جاتا ہے تو ایسا خدا آپ کو مبارک ہو۔ مجھے تو بیدین ہی مرنے دیجئے۔ "جرم محبت" کی سزا میں مجھے "دوزخ" گوارا ہے لیکن وہ "جنت" منظور نہیں جو صرف "اشداء علی الکفار" کے لئے مخصوص ہے۔ ایسے سر کہ پیشانی اور خشک عبوس چہرہ رکھنے والے مولویوں کے ساتھ اگر فردوس ملے بھی تو بقول غالبؔ وہ دوزخ میں ڈالدینے کے قابل ہے۔

اگر آپ نے آیندہ اس سے زیادہ کچھ اور کہا، تو اس سے زیادہ کچھ اور سننے کے لئے بھی طیار رہئے ـــــ آپ کے خلوص کا قایل ہوں، آپ کی دوست نوازی کا معترف ہوں، اس لئے اب کیا ضرور ہے کہ آپ مجھے اپنی "عقل و ہوش" کے متعلق بھی رائے زنی پر مجبور کریں۔

مُلک کی خدمت

ہر اہلِ وطن کا فرض ہے کہ ملکی ایجادات کو فروغ دیں اور خصوصًا ایسی فرموں کو جو ایک عرصہ دراز سے ملکی بھائیوں کی خدمت نہایت ایمانداری اور نیک نیتی سے انجام دے رہی ہیں۔ ان ہی چند فرموں میں سے ایک شہر اندور کا مشہور و معروف طبی دواخانہ یونانی ہے جو سوا سو سال سے مرکبات نہایت عمدگی صفائی۔ پاکیزگی اور پورے اوزان سے تیار کرنا اپنا فرض منصبی جانتا ہے۔ ایسی فرم سے پورے طور پر واقف ہونے کے لئے آج ہی ایک کارڈ لکھکر تمام امراض کی ادویات پر کافی روشنی ڈالتی ہوئی فہرست مفت طلب فرما کر ملاحظہ فرمائیں۔

طبی دواخانہ یونانی

آف اندور
۶۶ محمد علی روڈ بمبئی ۳
نیاز مند "مینجر"

تذکرہ معرکہ سخن

یہ تذکرہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کا صرف پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اردو کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب دمی اکمہ یکجا کردئے گئے ہیں۔ فن شعر و انشاء کے شائقین کے لئے عجیب چیز ہے۔ قیمت معہ محصول عہ

مینجر نگار۔ لکھنؤ

سوئٹزرلینڈ کے وفاق کی چند خصوصیات

(بہ سلسلہ ماہ جون ۳۶ء)

نظام وفاق کے عناصر سوئٹزرلینڈ کی وفاقی حکومت ایسا ذمہ دار عناصر پر مشتمل ہے:-

(۱) قومی اسمبلی جسے اہل سوئٹزرلینڈ کی اصطلاح میں "بنڈیز ورسام ملنگ انزامبلی فیدرائے" کہتے ہیں۔ یہ ملک کی سب سے بڑی نمایندہ جماعت ہے۔

(۲) فیڈرل کونسل (بندسرات کونزیل فیدرائے) جو سات ممبران کی ایک انتظامی جماعت ہے۔

(۳) فیڈرل ٹریبونل (بندیزگریش) اور

(۴) شرکائے کانفیڈریشن جو بلا واسطہ اپنی رائے سے عمل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اور جنھیں بندوبست حکومت پر قابو ہے۔ اور اسی بندوبست کے ذریعہ گویا تمام حکومت پر قابو ہے۔

ہم ان عناصر پر یکے بعد دیگرے روشنی ڈالیں گے۔

(۱) قومی اسمبلی:-

سوئٹزرلینڈ کے دستور اساسی کے رو سے یہ کانفیڈریشن کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ اسکے دو جزو ہیں نیشنل کونسل اور کونسل آف سٹیٹ۔ نیشنل کونسل گویا ایوان عام ہے اور کونسل آف سٹیٹ ایوان امراء ہے۔ نیشنل کونسل کے ممبران کو کینٹونوں کے عوام اپنے اپنے صوبوں میں سے انتخاب کرتے رہے ہیں مگر ۱۹۱۹ء کے بعد سے یہ انتخاب بذریعہ تناسب آبادی ہونے لگا ہے۔ ان ممبران کا انتخاب تین سال کی مدت کے لئے ہوتا ہے۔ دستور اساسی میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ہر وہ کینٹون اپنا ایک نمایندہ بھیجے گا جس میں بیس ہزار آدمی بستے ہیں اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ نصف کینٹونوں کا بھی ایک ایک نمایندہ قومی اسمبلی میں شامل ہوگا ہر بالغ شہری کو انتخاب میں حصہ لینے کا حق ہے۔ کل ممبران کی مدت بیک وقت ختم ہوتی ہے اور تمام ملک میں انتخابات ایک ہی دن ہوتے ہیں۔ یہ دن اکتوبر کا آخری یکشنبہ مقرر ہے۔ نیشنل اسمبلی کے ہر دو ایوان تین سال تک اپنے اجلاس کرتے ہیں۔ اسمبلی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ اپنے وجود کو درمیان میں منسوخ کر دے۔ ایکسال میں چار مرتبہ اس کے اجلاس مقرر ہوتے ہیں۔ پہلا اجلاس مارچ میں، دوسرا جون میں، تیسرا ستمبر میں، اور

چوتھا دسمبر میں ہوتا ہے۔ ہر اجتماع کے لئے جداگانہ صدر اور نائب صدر کی قید لازمی ہے۔ ان میں سے کوئی دوسرے اجتماع میں صدر، یا نائب صدر منتخب نہیں ہو سکتا۔ ممبران اسمبلی کو جمہور کے خزانے سے پچیس فرانک روزانہ علاوہ سفر خرچ ملتے ہیں۔ ایوان کا اجلاس موسم بہار میں آٹھ بجے صبح اور موسم سرما میں ۹ بجے شروع ہوتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ تین ہفتے میں ختم ہو جاتا ہے۔

کونسل آف سٹیٹ میں بیالیس ممبر ہوتے ہیں ہر کینٹون سے دو دو ممبر منتخب ہو کر آتے ہیں۔ ان ممبران کے طریق انتخاب ان کی قابلیت اور ان کی مدت ممبری اور تنخواہ کے سلسلے میں دستور اساسی نے کوئی مخصوص قاعدہ وضع نہیں کیا۔ بلکہ ان امور کا سرانجام ہر کینٹون پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ گو انتخاب وغیرہ کے سلسلے میں بعض طریقے بالعموم رائج ہیں اور مروج ہوتے جاتے ہیں۔ تاہم ان میں یکسانیت نہیں پائی جاتی اور نہ دستور اساسی ایسا ہونا ضروری خیال کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر کینٹونوں میں کونسلر عام انتخاب سے لئے جاتے ہیں مگر سات کینٹون ایسے ہیں جن میں لیجسلیچر ہی ان کا انتخاب کرتی ہے۔ پانچ کینٹون اور نصف کینٹون ایک سال کے لئے ایک کونسلر منتخب کرتے ہیں۔ ان کونسلروں کی تنخواہیں وہی ہوتی ہیں جو ممبران نیشنل کونسل کی مقرر ہیں۔ یہ تنخواہیں کینٹونوں کی طرف سے دی جاتی ہیں۔

بعض ضروریات کی تکمیل کے لئے (جیسے کمانڈر انچیف کا انتخاب یا مسائل قانونی کا تصفیہ) دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس ہوتا ہے۔ اس اجلاس کی صدارت نیشنل کونسل کا صدر کرتا ہے۔ دونوں ایوانوں کے اختیارات قریب قریب یکساں ہیں۔ جہاں تک دستوری اہمیت کا تعلق ہے۔ نیشنل کونسل زیادہ وقیع سمجھی جاتی ہے اور وہ لوگ جو سیاسی ولولوں سے لبریز ہوتے ہیں۔ بالعموم نیشنل کونسل میں داخل ہو کر اپنی سیاست دانی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ہر ایوان میں ایک بیورو ہوتا ہے۔ یہ بیورو ایک جماعت ہے جو نیشنل کونسل میں پانچ اور کونسل آف اسٹیٹ میں تین افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ پریزیڈنٹ لازمی طور پر اس جماعت میں شامل ہوتا ہے۔ بیورو کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ شمار آراء کے وقت ایوان کی مخالف اور موافق آراء کا اندازہ کرے۔

ممبران ایوانوں میں محض جرمنی اطالوی یا فرانسیسی بول سکتے ہیں اور ہر مسودہ قانون انہی تینوں زبانوں میں مشتہر کیا جاتا ہے۔

غالباً یہ بات حیرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ سوئٹزرلینڈ کے ایوانوں میں گرما گرم بحثیں بالکل نہیں ہوتیں کارروائی زیادہ سے زیادہ تاجرانہ طریقوں سے عمل میں لائی جاتی ہے۔ طنزیات اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے مواقع بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ مقرروں کی تقاریر میں بہت کم مداخلت کی جاتی ہے۔ تقریریں اس طرح کیجاتی ہیں

گویا معمولی گفتگو ہو رہی ہیں۔
نیشنل کونسل میں لوگ کھڑے ہو کر بولتے ہیں کونسل آف سٹیٹ میں اپنی نشستوں پر بیٹھے بیٹھے تقریر کرتے ہیں۔ تقسیم آراء کے مواقع بھی بہت ہی کم آتے ہیں۔ ایوان میں نشستوں کا انتظام پارٹیوں کے لحاظ سے نہیں بلکہ کینٹونوں کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ ایک پارٹی کے افراد ضروری نہیں کہ ایک ہی جگہ بیٹھیں وہ اپنے اپنے کینٹونوں کے ہمراہ بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح وزارت یا مخالف پارٹی کے لئے بھی نشستیں مخصوص نہیں ہیں۔
ممبران کے لئے ایوانوں میں حاضری لازمی سمجھی جاتی ہے۔ اگر کوئی ممبر بغیر معقول وجہ بتائے غیر حاضر ہو جائے تو وہ بے پرواہ خیال کیا جاتا ہے تاوقتیکہ وہ غیر حاضری کے جواز میں کوئی معقول وجہ پیش نہ کرے۔ اسے اس دن یا ان دنوں کی تنخواہ بھی نہیں ملتی۔
سوئٹزرلینڈ کے ایوانہائے حکومت پارٹیوں کے وجود سے خالی نہیں ہیں۔ مگر یہ پارٹیاں انگلینڈ یا فرانس کی پارٹیوں جیسی قوت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ ایک طرف تو انتظامی شعبوں میں ایوان، وزراء کو معزول کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ دوسری طرف ان کا کوئی فیصلہ اسوقت تک قانون نہیں بن سکتا جب تک کہ عوام اس پر مہر تصدیق ثبت نکر دیں۔
موٹے موٹے اصولوں پر اتفاق رائے کر لینے سے پارٹی وجود میں آجاتی ہے۔ ان معاملات میں جو ان اصولوں سے باہر ہوتے ہیں پارٹی کے ہر فرد کو آزادانہ طور پر رائے دینے کا حق ہوتا ہے۔ جب عہدہ داروں وغیرہ کے انتخاب کا سوال آتا ہے۔ پارٹی کے افراد سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کس کس کو منتخب کرنا چاہیئے۔
حکومت کا طریق یہ ہے کہ یا تو ایوانوں کے سامنے وہ قانون پیش ہوتے ہیں جن کی ضرورت ایگزکٹو کے افسر محسوس کرتے ہیں یا رائے عامہ کی درخواست پر قوانین وضع کئے جاتے ہیں۔ اول الذکر صورت میں فیڈرل کونسل قانون وضع کرتی ہے۔ اور اس کے ایک یا دو ممبر مسودہ پیش ہوتے وقت ایوان میں موجود ہوتے ہیں۔ تاکہ ہر پیچیدہ امر کی تشریح کر سکیں۔ موخر الذکر صورت میں کسی ممبر کی طرف سے ایک تجویز پیش ہو کر پاس ہوتی ہے۔ جس میں فیڈرل کونسل سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ رائے عامہ کو تسلیم کرتے ہوئے۔ فلاں فلاں قسم کا قانون وضع کرنے کی طرف قدم اٹھائے۔ مالی مسودات بھی فیڈرل کونسل ہی کے اختیار میں رکھے جاتے ہیں۔

(۲) فیڈرل کونسل:۔

اب ہم نظام وفاق کے دوسرے عنصر یعنی فیڈرل کونسل کو لیتے ہیں سوئٹزرلینڈ کے وفاقی نظام حکومت کا یہ عنصر گہرے مطالعہ کا مستحق ہے۔ بالعموم ایگزکٹو ایک فرد واحد کی بجائے ایک جماعت کو سپرد نہیں ہوتا۔ اور اگزکٹو عام طور پر پارٹی پالیٹکس سے اتنا بے تعلق بھی نہیں ہوتا جتنا سوئٹزرلینڈ میں ہے۔ فیڈرل کونسل کیبنٹ نہیں ہوتی (جیسا کہ برطانیہ یا ان ممالک میں دستور ہے جو برطانیہ کی آئینی نقل کرتے ہیں) کیونکہ اسے اسمبلی کی رہبری

کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور نہ یہ لیجیسلیچر کے اثرات سے آزاد ہے (جیسا کہ امریکہ میں یا امریکہ کے دستور کی پیروی کرنے والے ممالک میں ہے) آئینی اعتبار سے اس کا پارٹی پالیٹکس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

یہ جماعت سات افراد پر مشتمل ہوتی ہے جنھیں اسمبلی تین سال کے لئے منتخب کرتی ہے۔ ان ممبروں میں سے ایک کو اسمبلی ایگزیکٹو کا صدر اور کسی دوسرے کو اس کا نائب صدر بنا دیتی ہے۔ سال آئندہ میں ان دونوں میں سے کوئی اس عہدے پر فائز نہیں ہو سکتا۔ یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے کہ ایک کینٹون میں سے ایک ہی ممبر چنا جا سکتا ہے ایگزیکٹو کونسل کے ممبران اس دوران میں جبکہ وہ ایگزیکٹو میں کام کر رہے ہوں دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک ایوان کی کارروائی میں عملی حصہ نہیں لے سکتے اور نہ کوئی عہدہ قبول کر سکتے ہیں۔

ہر ممبر کو ایک ایک انتظامی شعبہ سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ اسکے بندوبست کا پورے طور پر ذمہ دار ہوتا ہے، مگر سال میں ایک مرتبہ فیڈرل کونسل کا اجلاس بطور کیبنٹ ہوتا ہے اور ضروری اُمور پر گفتگو کی جاتی ہے۔ کونسل کے تمام فیصلے متفقہ ہوتے ہیں۔ اور وہ طول طویل رپورٹ بھی جو اس کی طرف سے ہر سال اسمبلی کو پیش کی جاتی ہے۔ اتفاق رائے سے مرتب ہوتی ہے۔

کونسل کے ممبران ایوانوں میں آتے ہیں۔ مگر وہ عملاً ایوانوں کی کارروائی میں حصہ نہیں لے سکتے جب کوئی ایسا معاملہ ایوان میں پیش ہوتا ہے جو ایگزیکٹو کونسل کے کسی شعبہ سے متعلق ہوتا ہے تو فیڈرل کونسل کا وہ ممبر جو اُس شعبہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ صورت حال کی وضاحت کے لئے ایوان میں طلب کر لیا جاتا ہے۔

فیڈرل کونسل کا صدر باقی ممبران پر کوئی آئینی تفوق نہیں رکھتا۔ وہ صرف صدر ہوتا ہے۔ مگر اسے کانفیڈریشن کا صدر سمجھا جاتا ہے اور وہ قوم میں بزرگترین شخصیت شمار ہوتا ہے۔ تمام تقاریب پر اسے صدارت کا اعزاز ملتا ہے اس کی تنخواہ چھبیس ہزار فرانک سالانہ ہوتی ہے۔ باقی ممبران میں سے ہر ایک کو اٹھارہ ہزار فرانک سالانہ ملتے ہیں۔

عام انتظامی معاملات کی نگرانی کرنے کے علاوہ فیڈرل کونسل معاملات خارجہ، فوج اور سول سروس کے بندوبست کی بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس کے ذمہ ایک اور اہم فریضہ (جس پر پہلے بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے) یہ ہے کہ وہ قوانین کے مسودات تیار کر کے ایوان کے سامنے پیش کرے۔ جب کسی مخصوص غرض کی تکمیل کے لئے کوئی آئینی قدم اُٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے تو کونسل قانون کا مسودہ تیار کرتی ہے۔ اور بالعموم یہ دونوں ایوانوں کو صلاح اور مشورہ بھی دیتی ہے۔ عام پالیسی کی باگ ڈور اسمبلی کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ گو کونسل اپنے علم اور تجربے سے اس کے فیصلوں پر گہرے اثرات ڈالتی ہے۔ بالعموم انتظامی اُمور کونسل کے سپرد ہوتے ہیں۔ جیسے قومی مالیات کا جمع خرچ اور چند دیگر اہم شعبہ جات جیسے ریلوے وغیرہ۔ اسمبلی ان تمام اُمور کی انجام دہی میں

کونسل کی استمداد کرتی ہے نہ صرف فوج کونسل کے حکم پر ہوتی ہے بلکہ قومی خزانے سے جو رقم کینٹونوں کو ملتی ہے اس کے روکنے کا اختیار بھی کونسل کو ہوتا ہے۔ اور وہ امداد بند کر کے کسی باغی کینٹون کو اطاعت پر مجبور کر سکتی ہے

فیڈرل کونسل کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ گو وہ ہم آہنگ ہو کر کام کرتی ہے مگر اس میں اختلاف رائے بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور اسے برداشت بھی کیا جاتا ہے۔ ممبران کونسل لیجیلیچر میں وقت ضرورت اپنی ایسی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ جو ایگزکٹو کی مجموعی رائے سے مختلف ہوتی ہے۔ مگر اس اختلاف رائے سے کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اُمور متنازعہ فیہ کے بارے میں یا تو اس کونسلر کی رائے سے مطابقت کر لی جاتی ہے جو اس معاملہ سے قریبی تعلق رکھتا ہو۔ یا پھر اسمبلی کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا جاتا ہے۔

قانونی اعتبار سے کونسل اسمبلی کی ملازم ہوتی ہے لیکن عملاً یہ اسمبلی پر بڑا اثر رکھتی ہے۔ اور ایک اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایک طرف یہ اسمبلی کی پیروی کرتی ہے تو دوسری طرف اس کی رہنما بھی ہے۔ بایں ہمہ کبھی کبھی اسمبلی اس کے فیصلوں کو رد بھی کر دیتی ہے مگر اس سے کونسل کی پوزیشن پر بھی عملاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ برابر اپنا آئینی کام کئے چلی جاتی ہے۔

دستوری اعتبار سے کونسل کے وجود کے دو بڑے فائدے ہیں :۔

(۱) یہ ایک ایسی جماعت ہے جو نہ صرف حکمران جماعت یعنی اسمبلی کو صلاح مشورہ دیتی ہے بلکہ تجربہ کار اور غیر جانبدار ہونے کی وجہ سے بشرط ضرورت دو مختلف الخیال جماعتوں کے درمیان حَکم کا کام بھی انجام دے سکتی ہے

(۲) اس کے ذریعہ انتظامی درجہ رکھنے والے دماغ قوم کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں، خواہ وہ اسمبلی سے کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ رکھتے ہوں۔ کیونکہ کونسل اسمبلی سے جزواً جزواً موافقت رکھتے ہوئے بھی انتظامی اُمور کو سر انجام دے سکتی ہے۔

آئندہ صحبت میں ہم نظام وفاق کے دیگر عناصر پر روشنی ڈالیں گے۔

ڈاکٹر سید جعفری بار ایٹ لا

ضرورت ہے

رشتہ کی ایک ۱۸ سال کی ناکتخدا لڑکی کے لئے جو معزز خاندان کی نہایت قبول صورت، تعلیم یافتہ، صحیح و توانا، سلیقہ مند، سلیم الطبع سینے پرونے اور کاڑھنے کی ماہر ہے۔ انگریزی نہیں جانتی۔ صرف وہ اصحاب خط و کتابت کریں جو برسر روزگار ہیں یا کوئی ذاتی معقول آمدنی رکھتے ہیں۔ ن۔م۔ ذریعہ منیجر نگار لکھنؤ

مسئلۂ خلافت و امامت

اور

محترم مدیر "نگار" کا محاکمہ

(ہر نا تمام کے قلم سے)

مارچ ہی مارچ سال بھر اور اب جولائی تک چار مہینے اتنا عرصہ ہوا جب اس مسئلہ پر میرا سب سے پہلا مضمون شائع ہوا تھا۔

جو اصحاب یہ خیال رکھتے ہوں کہ میں نے نگار میں مضمون اس توقع پر لکھا تھا کہ مدیر نگار میری رائے سے حرف بحرف موافقت ہی کریں گے وہ بالکل غلطی پر ہیں۔

میں کس طرح یقین دلاؤں کہ مجھے شیعہ و سنی کسی جماعت کے ساتھ کوئی جانبدارانہ تعلق نہیں ہے۔ اگر کسی جماعت کو میری آزادانہ تحقیق شیعی مذہب کے موافق نظر آئی ہو تو اس سے یہ سمجھ لینا کبھی صحیح نہیں تھا کہ میں شیعہ ہی ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں میں "سطحیت" بہت زیادہ پیدا ہو گئی ہے اور اُن کی نگاہیں کسی مطلب کی گہرائی میں جانے سے انکار کرنے لگی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سنیوں میں میرے مضمون پر شور برپا ہوا اور اخباروں کی دنیا میں غلغلہ ہو گیا لیکن مدیر نگار کے محاکمہ پر "اطمینانی سکون" چھا گیا۔ گویا وہ سمجھے کہ ڈگری بالکل ہمارے موافق ملی۔ اس کے برخلاف شیعی جماعت اُس وقت تک صبر و سکون کے ساتھ نتیجہ کا انتظار کرتی رہی جب تک کہ مسئلہ زیر بحث تھا لیکن ادھر مدیر نگار کا محاکمہ شائع ہوا اور شیعی جماعت میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ گویا تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ کوئی مجھ غریب کو کوسنے دے رہا ہے کہ اس نے نگار میں اس بحث کو شایع ہی کیوں کیا۔ کوئی نگار کے محاکمہ کا سخت سے سخت اور مناظرانہ جواب دینے کو آمادہ ہے۔

گر مجھے اس سب پر مسرت ہے کہ میں نے تحقیقاتی بحث کا ایک دروازہ کھولکر علمی دنیا میں چہل پہل پیدا کر دی اور موجودہ صورت حال پر ہنسی آتی ہے کہ یہ نتیجہ اُلٹا کیونکر ہو گیا۔

میرے خیال میں مدیر نگار نے جہاں تک میرے زاویۂ بحث کا تعلق ہے فیصلہ بالکل میرے موافق کیا ہے اور اگر میرے مضمون سے شیعی اصحاب متفق تھے تو انھیں فیصلہ کے اس جزو سے بالکل مطمئن ہونا چاہئے تھا اور جہاں سے مدیر نگار کا فیصلہ مخالف نظر آتا ہے وہ ایسا جزو ہے کہ اس پر سنیوں کو بھی اسی حد تک برافروختہ ہونا چاہئے تھا جس حد تک شیعوں کو۔

میرے مضمون کی حیثیت وہ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی جو کسی شیعہ عالم کے قلم سے نکلے ہوئے مضمون کی جس میں مسئلہ امامت پر خالص اعتقادی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ اسی لئے میرے مضمون میں کلامی دلائل اور عقلی براہین کا پتہ بھی نہیں ہے۔ میں نے تو صرف تاریخی حیثیت سے واقعات کی بنا پر یہ دکھلایا تھا کہ حضرت پیغمبر کا منشار یہی تھا کہ حضرت علی اُن کے خلیفہ اور جانشین ہوں۔

اس صورت میں میرے خلاف فیصلہ ہونے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اُن واقعات کو صحیح تسلیم نہ کیا جاتا جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُن واقعات کا نتیجہ وہ تسلیم نہ کیا جاتا جو میں نے قرار دیا ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ مدیر نگار کا فیصلہ ان دونوں جزوں میں میرے بالکل موافق ہے۔

اُنھوں نے میرے پیش کردہ تمام روایات تاریخی کو تسلیم کیا ہے۔ صرف ایک روایت واقعۂ قرطاس کے متعلق شبہ کیا ہے کہ "اس کا تعلق اول تو وصایت جناب امیر سے ہے بھی نہیں (کیونکہ اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ کاغذ و قلم منگوا کر کیا لکھوانا چاہتے تھے) اور دوسرے یہ کہ یہ حدیث اہل سنن کے نزدیک قابل لحاظ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے خاص راویوں میں ایک یحییٰ بن سلیمان ہیں جو غیر ثقہ قرار دئے گئے ہیں، دوسرے راوی قبیصہ ہیں جو بہت غلط گو سمجھے جاتے ہیں، تیسرے یونس بن زید ہیں جن کا حافظہ بھی ضعیف تھا اور جو غلط گو بھی تھے، چوتھے راوی علی بن عبداللہ ہیں جن کا شمار ضعفار میں ہے۔ رہ گئے ایک اور راوی حضرت ابن عباس سو ان کا اُس وقت وہاں موجود ہونا ثابت نہیں"

مجھے بہرحال مدیر نگار کی آزادرائے کا احترام ہے لیکن اتنا کہنا ضروری ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ اس روایت میں شکوک ظاہر کئے ہیں وہ عام اہلسنت کی جانب سے پیش نہیں ہو سکتے اس لئے کہ اُن کے قواعد کی بنا پر روایت کا صحیح بخاری کے اندر متعدد طریق سے ہونا ہی اُس کی صحت و وثاقت کے لئے کافی ہے جس کے بعد راویوں کی جانچ پرتال کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر اگر ہر ایک سند میں کوئی ایک راوی مجروح مان لیا جائے تو آخر تین چار الگ الگ راویوں کے طریق سے روایت کا وارد ہونا بھی تو ایک قابل لحاظ چیز ہے اور پھر جبکہ اس روایت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو غلط طور سے بیان کرنے کی کوئی مخصوص غرض ہو سکے۔ جبکہ اُس کے راویوں میں کوئی ضعیف ہو۔ غیر ثقہ ہو۔ غلط گو ہو مگر "رافضی" کوئی ایک بھی نہیں ہے تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ صرف حضرت عمر پر رسول کی بارگاہ

میں بے ادبی کا الزام لگانے کے لئے یہ روایت ایجاد کی گئی ہے۔ رہ گیا یہ امر کہ رسول آخر لکھنا کیا چاہتے تھے؟ اسکو صراحت کے ساتھ تو میں بیشک نہیں دکھلا سکتا جبکہ وہ لکھا ہی نہیں گیا۔ لیکن میں نے جس ترتیب کے ساتھ اس واقعہ کو اپنے مضمون میں درج کیا ہے اس سے حقیقت کا انکشاف ضرور ہوتا ہے۔ پھر جبکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ پیغمبر اپنی تقریر میں "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کہکر یہ فقرہ کہہ چکے تھے کہ: "انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اہل بیتی ماان تمسکتم بہمالن تضلوا بعدی" اور اس کے بعد دوات قلم مانگتے وقت آپ فرماتے ہیں:۔ "اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ" اس سے ضرور پتہ چلتا ہے کہ تحریر بھی اسی کے متعلق ہونے والی تھی جس کے متعلق تقریر تھی۔ نیز حضرت عمر کا انکار کہ "ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے، اور کوئی ضرورت نہیں" جبکہ مدیر نگار اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ رسول کا منشا یہی تھا کہ حضرت علی خلیفہ ہوں اور نیز یہ کہ دوسرے صحابہ کو یہ منظور نہیں تھا اور یہ بھی کہ دوسرے صحابہ حضرت علی سے رشک رکھتے تھے۔

بہرحال اس روایت سے قطع نظر کرتے ہوئے دوسری تمام روایات کو مدیر نگار نے تسلیم کیا ہے اور آخر میں یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ:۔

"جس حد تک روایات کا تعلق ہے میرے نزدیک حضرات شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہ کی دلی خواہش یہی تھی کہ حضرت علی آپ کے بعد جانشین قرار دئے جائیں"

بس۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میرے مضمون کا تعلق تھا بحث یہاں پر ختم ہوگئی۔ حضرت رسول کی دلی خواہش یہی تھی اور حضرت نے صحابہ کے لئے اس خواہش کو پورے طور پر ظاہر بھی کیا، یقیناً اور اگر ظاہر نہیں کیا تو ہم کو اور محترم مدیر نگار کو اس کی خبر کیونکر ہوئی؟

اب یہ کہ آپ کی خواہش صحیح تھی یا غلط اور یہ کہ آپ کی خواہش کا پورا ہونا ممکن تھا یا نہیں؟ یہ تنقیحیں ہیں جو اب قائم کی گئی ہیں اور نیز یہ کہ اگر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تو کیا یہ کوئی مسئلہ ایسا اہم تھا جو تفریق مذاہب کا باعث ہو سکے؟۔

یہ چیزیں میری بحث سے خارج ہیں اور یقیناً اب یہ اعتقادی چیزیں ہیں جن پر ایک غیر مسلم شخص کو بحث کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں مسلمانوں کا عقیدہ رسول کی نسبت یہ رہا ہے کہ آپ کا کوئی حکم اور کوئی امر حکم خدا کے خلاف نہیں ہوتا تھا اور یہ کہ آپ کی ہستی غلطی سے بالکل بلند ہے۔

اب اگر "مدیر نگار" اس مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں تو یہ ویسے بہت سے مسائل میں داخل ہے جو عام مسلمانوں میں متفقہ حیثیت رکھتے ہیں لیکن مدیر نگار کو اپنی "حریت رائے" کی بنا پر اُن سے اختلاف ہے جیسے

بہشت و دوزخ - ملائکہ - معجزات انبیاء وغیرہ وغیرہ -
غالباً شیعی اصحاب کا بھی یہ خیال ہے کہ مسئلۂ امامت اور نبوت کا چولی دامن کا ساتھ ہے یعنے اگر نبوت میں وہی معیاری حیثیت مسلم رہی جس پر شیعوں کا عقیدہ ہے اور جو ایک حد تک دوسرے مسلمانوں میں بھی متفقہ ہے تو امامت کے مسئلہ کا شیعوں کے حسب دلخواہ طے ہونا ضروری ہے - بے شک اگر اصطلاحی نبوت ہی کے معنی میں تبدیلی ہو جائے اور عقیدۂ رسالت ہی اُس شان پر باقی نہ رہے تو امامت بھی ختم ہے - اور شاید شیعوں کی جانب سے امامت کو " اُصول دین " میں داخل کرنے کا بھی یہی منشا ہے یعنے وہ اس کو نبوت کا ایک جزو لاینفک سمجھتے ہیں اور " ایمان بالنبی " کے تحت میں اُس کو ضروری خیال کرتے ہیں -

---

یہ امر کہ مسئلۂ امامت کا تعلق مذہب سے ہونا چاہئے یا نہیں ؟ میرے طے کرنے کا نہیں ہے لیکن جہانتک میری سمجھ میں آتا ہے جبکہ محترم مدیر نگار حضرت پیغمبر کی دو حیثیتیں تسلیم کرتے ہیں ایک معلم مذہب ہونے کی اور دوسرے حاکم و منتظم ہونے کی تو اس مسئلہ کا تعلق مذہب کے ساتھ اُسی وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک جانشینی کو صرف دوسرے جزو کے ساتھ مخصوص قرار دیا جائے جس کے بعد خلیفہ کی حیثیت سوائے بادشاہ کے کچھ نہیں ہو سکتی اور اس کے بعد ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر فرماں روا جس سے انتظام ملک ہو جائے وہ خلیفۂ رسول سمجھا جانا چاہئے یہاں تک کہ اعلیحضرت ملک معظم تاجدار برطانیہ اسوقت سب سے بڑے " خلیفۃ المسلمین " ہیں اسواسطے کہ عالم اسلامی کا زیادہ حصہ اُن کے زیر سلطنت و حمایت ہے اور امن و امان سے زندگی بسر کر رہا ہے لیکن اگر خلافت کا تعلق پہلے جزو سے بھی ہے جیسا کہ اب تک مسلمانوں کا خیال رہا ہے چنانچہ " خلافت " کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ :- " النیابۃ عن النبیؐ فی امور الدین والدنیا " تو اب مذہب کے ساتھ اس کا کھلا کھلا تعلق ہو جاتا ہے -
اگر اس میں یہ مذہبی پیشوائی کی حیثیت قائم نہ رکھی جائے اور حضرات خلفاء کی حیثیت وہی رہ جائے جو اسوقت بادشاہ عراق یا ایران یا حجاز وغیرہ کی ہے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ شیعہ اور سنی کا اختلاف باقی نہیں رہ سکتا - لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرات اہلسنت اس کو گوارا نہیں کریں گے - وہ حضرات خلفاء کو مذہبی پیشوا بھی تسلیم کرانا چاہتے ہیں اور یہیں سے شیعہ سنی اختلاف کی بنیاد قائم ہوتی ہے -
یہ استدلال کہ " رسول اللہ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی ہدایت اس باب میں نہیں کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی کے ذریعہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا " ممکن ہے کہ درست ہو مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے شیعہ اصحاب وحی کی ہدایت کو اس باب میں قران مجید سے بہت شد و مد کے

ساتھ ثابت کرتے ہیں اور علمائے اہلسنت ہی کے روایات سے اُس کی تفسیر بھی پیش کرتے ہیں۔
کاش اس مسئلہ پر اب کسی شیعہ عالم کی طرف سے بھی اظہار خیال کیا جائے جسے میرے خیال میں مدیر نگار بخوشی شائع کریں گے تاکہ بحث کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔

مجھے بیشک صرف اپنی اتنی ہی ریسرچ کی بنا پر جسے میں نے اپنے گزشتہ مضمون میں پیش کر دیا ہے اور جس پر مجھے خوشی ہے کہ محترم مدیر نگار نے مہر تصدیق بھی ثبت کر دی ہے تھوڑا سا اختلاف محترم مدیر کے اس فیصلہ سے ہے کہ رسول اللہ چاہتے ضرور تھے کہ جناب امیر خلیفہ قرار پائیں مگر آپ نے اس کا اعلان نہیں کیا۔ اور اس کی ذمہ داری خود اپنے اوپر نہیں لی۔

جبکہ ہمارے سامنے یہ واقعہ ہے کہ بیعت عشیرہ میں رسول نے اعلان کیا: "فایکم یوازرنی علیٰ ہذا الامر علیٰ ان یکون اخی و وصیتی و خلیفتی فیکم"۔ "کون تم میں سے میرا ساتھ دیتا ہے اس شرط پر کہ وہی میرا بھائی میرا ولی عہد اور میرا جانشین قرار پائے" علی اُٹھے اور کہا کہ میں آمادہ ہوں۔ حضرت نے یہ سنکر فرمایا کہ: "دیکھو یہ ہے میرا بھائی۔ میرا وصی اور جانشین"۔

اب بتلایئے کہ اگر روح جمہوریت اسی کی مقتضی تھی کہ رسول اس معاملہ کو اپنے ذمہ نہ رکھیں اور عام مسلمانوں پر چھوڑ دیں تو آپ کو خواہ مخواہ یہ سبز باغ دکھا کر اپنی نصرت کا وعدہ لینے کی کیا ضرورت تھی اور یہ معاہدہ کرنے کا حق کونسا تھا؟

اب سوائے اس کے کہ "بزمی صاحب" کی طرح اس کو صرف "حوصلہ افزائی" پر مبنی قرار دیا جائے اور کیا چارہ کار ہے؟ مگر اس معاملہ میں مدیر نگار فرما چکے ہیں کہ "یہ ایک ایسا دعوےٰ ہے جس پر نہ کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ جسے رسول اللہ سے منسوب کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے"۔

یہ ابتدائے رسالت کا قصہ تھا اور انتہائے رسالت میں خطبہ حجۃ الوداع جس میں (محترم مدیر نگار کے الفاظ میں) "رسول اللہ نے اپنے وصال کی خبر دیتے ہوئے کہا کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ"۔ میں جس کا مولیٰ ہوں علی بھی اس کا مولیٰ ہے"۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں اپنے بعد دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک کتاب اللہ اور دوسرے میری عترت، میرے اہلبیت اور انھیں دونوں کی پیروی کرنا چاہئے"۔

اب آپ ملاحظہ کیجئے کہ یہ اعلان نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ آخری تقریر ہے جو رسول اللہ نے اتنے بڑے مجمع میں کی۔ اس کے بعد آپ دو مہینہ سے زیادہ زندہ نہیں رہے۔ اس کے بعد یہ کہنا کہاں تک حق بجانب ہے کہ "رسول اللہ نے جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو اس باب میں خاموشی اختیار کر لی"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد اور زیادہ قریب زمانہ میں بھی رسول نے سکوت نہیں کیا۔ اُس وقت جب آپ

مرض الموت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ جبکہ آپ کے وصال میں صرف چند روز باقی تھے اُس موقع پر بھی آپ نے تقریر کی اور فرمایا:۔ "اے لوگو بہت قریب ہے وہ وقت کہ میں دُنیا سے اُٹھ جاؤں اور تم سے رخصت ہوں میں نے اس سے قبل تم سے سب کچھ کہدیا ہے اور حجت تمام کر دی ہے۔ پس تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تمھارے درمیان خدا کی کتاب اور اپنی عترت اہلبیت کو چھوڑے جاتا ہوں" یہ کہکر حضرت نے جناب امیر کا ہاتھ پکڑا اور اسے بلند کر کے فرمایا:۔ "علی قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی کے ساتھ، یہ دونوں جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہونچیں۔ میں ان سے دریافت کروں گا کہ تم نے ان سے میرے بعد کیا سلوک کیا (صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۷)

دیکھے جائیں یہ الفاظ کہ:۔ "قد قدمت الیکم القول معذرت الیکم"۔ "میں تم سے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہوں اور حجت تمام کر دی ہے"

اس کے بعد پھر بھی کہا جاتا ہے کہ رسول نے اعلان کیوں نہ کر دیا؟ بیشک اس کے بعد صرف ایک ہی چیز باقی تھی اور وہ تحریر۔ اُس کا رسول نے بندوبست کرنا چاہا جس کا صحیح بخاری میں واقعہ قرطاس کی صورت میں تذکرہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کیا معلوم حضرت کیا لکھنے والے تھے؟ بے شک کیا معلوم! لیکن اگر لکھنے دیا گیا ہوتا آپ کو جو کچھ لکھنا چاہتے تھے تو کیوں کسی کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ آپ خلافت ہی کے لئے لکھنا چاہتے تھے۔

حضرت رسول اکرم کے بار بار وہ الفاظ کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں جن سے تمسک کی صورت میں تم گمراہ نہ ہو گے۔ اور پھر آپ کا یہ کہنا کہ "ایسا نوشتہ لکھدوں جس پر عمل کرنے سے تم گمراہ نہ ہو" اور پھر حضرت عمر کا یہ فقرہ کہ "ہم کو بس کتاب خدا کافی ہے۔ اور کسی بات کی ضرورت نہیں" کیا اس کے یہی معنی پیدا نہیں ہوتے کہ حضرت عمر کو اپنی فراست کی بنا پر یہ یقین ہو گیا تھا کہ آپ وہی لکھنے والے ہیں جو آپ بہت دفعہ کہہ چکے ہیں جس میں آپ نے کتاب خدا کے ساتھ اپنی عترت اور اہلبیت کو ضم کیا ہے اور ان دونوں کی پیروی کو ذریعۂ نجات قرار دیا ہے اور اس کی بنا پر آپ نے یہ کہا کہ ہمارے لئے تو بس کتاب خدا کافی ہے۔ یعنے کسی دوسرے جز کی ہم کو ضرورت نہیں ہے۔

یقیناً ایک غیر متعلق اور بے غرض انسان مذکورہ صورت حال اور حضرت عمر کے اس فقرہ پر غور کرنے سے سوائے اس نتیجہ کے کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔

بے شک واقعہ قرطاس کے بعد فوراً رسول اللہ کا وصال نہیں ہوا بلکہ ہوش و حواس کے عالم میں اتنا وقت ملا کہ آپ اس کی تکمیل کر سکتے تھے لیکن حضرت عمر نے جن مدبرانہ الفاظ کے ساتھ اختلاف فرمایا تھا (جن کا صحیح بخاری میں تذکرہ موجود ہے) ان کے بعد کوئی محل آپ کو اپنی خواہش کے پورا کرنے کا باقی نہ رہا تھا

وہ یہ کہ آپ نے فرمایا تھا کہ " رسول پر مرض کا غلبہ ہے جس سے آپ کے ہوش و حواس جا چکے ہیں "
بعض روایات میں یہ فقرہ ہے کہ " ان الرجل لیہجر " ، " آپ ہذیان بک رہے ہیں " - آپ کے اس فقرہ کا
حاضرین پر بھی یہ اثر پڑ گیا تھا کہ بعض لوگ کہتے تھے کہ رسول جو کہتے ہیں ٹھیک ہے - قلم دوات حاضر کرو اور
بعض لوگ کہتے تھے کہ نہیں بات وہی ہے جو حضرت عمر نے ارشاد کی یعنے واقعی رسول کے ہوش و حواس
درست نہیں رہے - اب آپ فرمائیے کہ اس کے بعد رسول کو کب موقع تھا کہ کچھ تحریر کراتے اور اگر کچھ لکھواتے
بھی تو وہ مستند کب سمجھا جاتا جب کہ بخیال حضرات " بحالت صحت نفس و ثبات عقل " کی شرط ہی مفقود تھی -

میں اپنے مسلمان اصحاب اور خصوصیت کے ساتھ سنی احباب سے معذرت چاہتا ہوں - میں تو تاریخی
واقعات سے دیکھ رہا ہوں کہ غدیر خم کے واقعہ کے بعد ایک مکمل سازش ہو گئی تھی کہ رسول کا مقصد کامیاب
نہ ہونے دیا جائے اور اس سازش کے ارکان اتنے اندرونی تھے کہ رسول اپنے بستر بیماری پر بھی ان کے درمیان
گھرے ہوئے تھے - اور خود حضرت کو بھی اس سازش کا پورا اندازہ ہو گیا تھا - اسی سازش کے توڑنے کے لئے
آپ نے لشکر اسامہ کے بھیجنے کا بندوبست کیا تھا اور نام بنام تمام مفسر عناصر سے چاہا تھا کہ فضا کو صاف کر دیں
اور اس کے لئے اتنے تاکیدی احکام نافذ کئے تھے کہ " خدا کی لعنت ہے اس پر جو لشکر اسامہ میں نہ جائے "
مگر آپ کی عدول حکمی کی گئی جس کے بعد آپ کا کوئی اختیار نہیں تھا -

محترم مدیر نگار نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ بیشتر صحابہ کو حضرت علی سے رشک و رقابت اور عداوت
تھی اور مختلف وجوہ کی بنا پر آپ کے خلاف متفق تھے -

اس صورت حال میں وہ فرماتے ہیں کہ علی کا خلیفہ قرار پانا غیر ممکن تھا ، بے شک غیر ممکن تھا ، لیکن اس سے
تمام اصحاب الزام سے بری تو نہیں ہو جاتے -

فرض کیا جائے کہ ایک بادشاہ ، رئیس ، امیر کبیر کے تمام ملازمین اُسکے فرزند کے قتل کرنے پر متفق ہو جائیں
یقیناً اُس کا قتل ہو جانا اس صورت میں ناگزیر ہے لیکن کیا اس بنا پر قاتل بالکل بری قرار پا جائیں گے -

اس صورت میں کیا جماعت مسلمین ، عقیدت مندان رسول کو آزادانہ طور پر واقعات کی جانچ کرنے کے بعد
اس کا اقرار نہیں کرنا چاہئے تھا کہ جو کچھ ہوا وہ رسول کی مرضی کے خلاف ایک متفقہ بندوبست کا نتیجہ تھا جو قابل
افسوس ہے - نہ یہ کہ اس کے برخلاف " الصحابۃ کلھم عدول " ، " صحابہ سب کے سب عادل ہیں " کے نعرے
بنائے جائیں اور غزوہ بدر ، بیعت شجرہ وغیرہ کے پیغاموں کو بلا استثنا سب کے رستگار ، نیکوکار ہونے کی قطعی سند
قرار دے لیا جائے اور " اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم " کی سی روایتوں کو رسول کی زبانی بیان کر کے
ہر ایک کی پیروی کو ذریعہ نجات سمجھ لیا جائے -

محترم مدیر نگار کو یہ تسلیم ہے کہ "خلفائے ثلاثہ کی خلافت کا مسئلہ رائے عامہ حاصل کرنے کے بعد طے نہیں کیا گیا، لیکن جن ذاتی اثرات کے ماتحت یہ حضرات خلیفہ تسلیم کئے گئے وہ غالباً ایسے تھے کہ اگر رائے عامہ حاصل کی جاتی تو بھی شاید نتیجہ یہی نکلتا۔"

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ "ذاتی اثرات" رسول کے منشا کی موافقت میں کام نہیں آسکتے تھے اور جب ایسا نہیں ہوا تو مخالفت رسول کی ذمہ داری کیا اب انہی "ذاتی اثرات" والی ہستیوں پر عاید نہیں رہ جاتی؟ اور کیا اس صورت میں ان لوگوں سے اظہار اختلاف حضرت رسول کے ساتھ بجا (یا بیجا) عقیدت کا نتیجہ قرار نہیں پاتا لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معاملہ بالکل برعکس ہو گیا یعنے حضرات اہلسنت محبت رسول اللہ کے تنہا دعویدار بن گئے اور شیعہ جماعت کے متعلق یہ خیال قرار دیدیا گیا کہ ان کو رسول سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔"

پھر جبکہ پیغمبر نے اپنے انہی اظہارات میں (جنھیں محترم مدیر نگار بھی اعلان نہیں لیکن اظہار رائے کی حد تک صحیح سمجھتے ہیں اور یہ کہ ان کا منشا یہ تھا کہ اگر انتخاب کی نوبت آئے تو رسول کا ووٹ علی کے حق میں سمجھا جائے)۔ اس مسئلہ کو کسی خالص دنیاوی پہلو کے اعتبار سے نہیں پیش کیا بلکہ اسے گمراہی سے بچنے کا وسیلہ اور نجات کا ذریعہ بتایا تھا جیسا کہ (لن تضلوا) کے الفاظ بتا رہے ہیں۔ نیز یہ کہ "میں روز قیامت دریافت کروں گا کہ تم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟"

تو اب بتایئے کہ اس چیز کو مذہب سے الگ اور اخروی جزا و سزا سے غیر متعلق کیونکر قرار دیا جائے۔

بہرحال جیسا کہ میں نے اپنے دوسرے مضمون میں تحریر کیا ہے اسوقت مسلمانوں کے لئے مسئلۂ خلافت کا عملی پہلو صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوایان دین کو اپنا رہنما قرار دیں اور انکی تعلیمات پر عمل کریں" اگر یہ مسئلہ اسوقت بھی طے پا جائے اور تمام اہل اسلام متفقہ حیثیت سے عترت رسول کی مذہبی پیشوائی کو قبول کرلیں اور احکام و تعلیمات مذہبی میں انہی کے تعلیمات کو مستند سمجھنے لگیں تو پھر کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ خلافت یعنی بادشاہت تو ایک وقتی چیز ہے جس کے احکام انتظامی حیثیت رکھتے ہیں جن کا کوئی تعلق آیندہ نسلوں کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلئے اگر حضرات خلفاء کی حکومت کو اس حیثیت سے اُن کے زمانہ میں تسلیم بھی کیا جائے تو موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے ساتھ اُس کا کوئی عملی یا اعتقادی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ اور اسلئے موجودہ زمانہ میں شیعہ اور سنی کی تفریق کا کوئی سبب باقی نہیں رہتا۔ خدا کرے مدیر نگار کی کوشش کامیاب ہو اور مسلمانوں کی یہ باہمی تفریق دور ہو کر ایک مذہب قرار پائے جس کو کہا جاسکے "حقیقی اسلام"

بس مجھے اب اس سلسلہ میں کچھ کہنا نہیں ہے۔ مدیر نگار نے جو تنقیحات قائم کئے ہیں اُن پر اہلسنت اور شیعہ مذہب کے علماء کو بحث کرنا چاہئے اس لئے کہ زاویۂ بحث اب ایسے نقطہ پر پہونچ گیا ہے جو ایک "ہندو" کے دسترس سے باہر ہے۔

"ہرنام"

(نگار) گزشتہ فروری کے نگار میں مسئلۂ خلافت و امامت پر میرے محاکمہ کی اشاعت کے بعد

اسوقت تک متعدد مضامین شیعہ و سنی حضرات کے موصول ہوئے لیکن اُن کو شائع نہیں کیا گیا کیونکہ جو طریق استدلال ان میں اختیار کیا گیا ہے وہ یا تو یکسر مجادلانہ ہے یا پھر اُس انداز کا جو اس سے قبل بارہا استعمال ہو چکا ہے اور ناکام ثابت ہوا ہے۔

جس حد تک روایات کا تعلق ہے یقیناً حضرات شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہ جناب امیر کی خلافت چاہتے تھے اور اپنی اس خواہش کا آپ نے اظہار بھی فرما دیا تھا۔ اہلِ سنت دیگر خلفاء کے صرف فضائل بیان کر کے اس حقیقت کے مٹانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ سوال خلافت کا ہے نہ کہ محض فضیلت کا۔ اسی کے ساتھ اہل سنت کا مناظرانہ پہلو اسلئے اور بھی زیادہ کمزور ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے شیعہ روایات سے ثابت نہیں کر سکتے اور شیعی حضرات خود اہل سنت کی روایات سے حضرت علیؓ کی وصایت و خلافت کو ثابت کر دکھاتے ہیں۔

اس لئے اب اس مسئلہ پر بحث کرنا کہ رسول اللہ حضرت علی کو اپنا جانشین و خلیفہ بنانا چاہتے تھے یا نہیں بیکار ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ (اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد) نفس مسئلہ امامت پر گفتگو کی جائے یعنی یہ کہ اس کی اہمیت مذہب اسلام میں کیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ کہ کیا جناب امیر کی امامت واقعی منصوص تھی یا نہیں۔

اسی لئے میں نے ماہ مارچ ۳۶ء کے نگار میں چند مباحث متعین کر دئے تھے اور چاہتا تھا کہ شیعی علماء اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں، لیکن افسوس ہے کہ اسوقت تک کسی نے توجہ نہیں کی۔

اب جناب ہرنام کا (جو اس تحریک کے بانی ہیں) یہ دوسرا مقالہ شائع کیا جا رہا ہے، وہ بھی میرا محاکمہ دیکھنے کے بعد اب اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ میں پہلے شیعی علماء سے درخواست کروں گا کہ وہ تمام ان مباحث کو سامنے رکھکر جو ماہ مارچ ۳۶ء کے نگار میں درج کئے گئے ہیں، اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور اس کے بعد سنی علماء کو متوجہ کروں گا کہ وہ جواب دیں۔ لیکن دونوں فریق سے میری التجا یہی ہے کہ جو کچھ وہ لکھیں اس میں کوئی مجادلانہ پہلو نہ ہونا چاہئے، نیز یہ کہ روایتی استدلال میں وہ صرف فریق مخالف کی کتابوں کو سامنے رکھیں، ورنہ یوں تو اپنی اپنی روایات کو سامنے رکھکر ہمیشہ سبھی نے بحث کی ہے اور اسی لئے معقول نتیجہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔

"نگار" جنوری ۱۹۳۵ء کی بہت کم جلدیں رہ گئی ہیں اسکا مطالعہ کرنا گویا شعراء کے تمام تذکروں اور تاریخ اُردو کا مطالعہ کرنا ہے اسکی ضخامت ۲۳۶ صفحات اور قیمت عہ علاوہ محصول۔

منیجر نگار۔

باب الاستفسار

حروفی طبقہ

(جناب شیخ اکرام الحق صاحب۔ پشین)

نگار کے کسی آیندہ پرچہ میں دو چار حرف "حروفی طبقہ" کی بابت لکھ کر جو ایران میں پندرھویں صدی میں نمودار ہوا تھا، ممنون فرمائیے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی مستند کتاب مل جائے تو واقفیت پیدا کرلوں، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اب مجبوراً آپ کو تکلیف دیتا ہوں اور امید واثق ہے کہ اس التجا کو رد نہ کریں گے۔

(نگار) حروفی طبقہ فی الحقیقت ایک شیعی طبقہ ہے جس کا بانی ایک شخص فضل اللہ تھا۔ یہ استراباد کا رہنے والا تھا اور آٹھویں صدی ہجری کے اخیر یا چودھویں صدی میں پایا جاتا تھا۔

اس کی اشاعت سلطنت عثمانیہ میں ایک شخص علی الاعلیٰ کے ذریعہ سے بہت کافی ہوئی جو فضل اللہ کا مرید خاص تھا۔ ترکی میں بکتاشی درویشوں کا گروہ اسی مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔

ان کے عقاید کا حال ان کی مشہور کتاب محرم نامہ سے معلوم ہو سکتا ہے جو ۸۲۸ھ میں مرتب کی گئی تھی مختصراً یہاں درج کئے دیتا ہوں:۔

۱۔ دنیا قدیم ہے اور برابر گردش کر رہی ہے

۲۔ تغیرات عالم کا سبب یہی گردش ہے

۳۔ تغیرات عالم کے مختلف دور ہوا کرتے ہیں جس کی ابتدا و انتہا یکساں ہوتی ہے یعنی شروع میں آدم کا ظہور اور آخر میں یوم حساب

۴۔ خدا نے انسان کی شکل اور خصوصیت کے ساتھ اس کے چہرہ میں ظہور کیا ہے

۵- خدا کا یہ ظہورِ مختلف پیغمبروں کی شکل میں یکے بعد دیگرے ہوا اور پھر اولیا کی شکل میں۔

۶- آخری پیغمبر محمد تھے۔ اور اس کے بعد اولیار کا دور آیا جس کی ابتدا حضرت علی سے ہوئی اور انتہا امام حسن عسکری (گیارھویں امام) پر فضل اللہ کو بھی وہ انھیں اکابر میں سے مانتے تھے جن میں خدا حلول کر گیا تھا۔

۷- انسان کی امتیازی خصوصیت اس کی زبان یا قوت گویائی ہے جو عربی کے ۲۸ حروف میں منحصر ہے۔

انھوں نے حروف ابجد کے اعداد سے عجیب وغریب باتیں پیدا کی ہیں اور ان کے عقاید زیادہ تر انھیں مفروضات پر قایم ہیں جو اعدادِ حروف سے انھوں نے پیدا کئے ہیں اور اسی لئے انھیں حروفی کہتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ انسانی شکل کے امتیازی خطوط سات ہیں اور اُن کو جب چار عناصر سے ضرب دوگے تو حاصل ضرب ۲۸ ہوگا جو تعداد ہے عربی حروف کی۔

ان کی خاص خاص کتابیں یہ ہیں:- محرم نامہ - ہدایت نامہ - جاودان - حقیقت نامہ - استوا نامہ۔ ان میں سے بعض ترکی زبان میں ہیں اور بعض استرابادی ملی ہوئی فارسی میں۔ اور درویشوں کی طرح انکے یہاں ذکر وشغل نہیں پایا جاتا۔ وہ روز صبح کو اپنے پیرِ طریقت کے مکان پر جمع ہوتے ہیں جسے وہ بابا کہتے ہیں۔ بابا ان کو اپنے خادم کے ذریعہ سے ایک ایک پیالہ شراب یا نبیذ کا، ایک ٹکڑا روٹی کا اور تھوڑا سا پنیر تقسیم کرتا ہے یہ لوگ پیالہ کو لیکر آنکھ اور سر سے لگاتے ہیں اور پھر پیکر بہت ہو حق مچاتے ہیں۔

کیا عہد قدیم کا انسان زیادہ صحیح وتوانا تھا

(جناب سید محمد رفیع صاحب - آگرہ)

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ آج کل بیماریوں کی کثرت تمدن جدید کی وجہ سے ہے اور اس سے قبل جب انسان وحشی تھا تو وہ نہ بیمار پڑتا تھا اور نہ جلد مرتا تھا۔ کیا یہ صحیح ہے۔

(نگار) بالکل غلط ہے۔ اور افسوس ہے کہ اس غلطی میں اکثر پڑھے لکھے آدمی بھی مبتلا ہیں۔ میں نے خود بہت قابل لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جتنی ترقی ڈاکٹری یا علم طب میں ہوتی جاتی ہے اتنی ہی بیماریاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ اس سے قبل جب انسان پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتا تھا تو نہ اُسے کوئی بیماری لاحق ہوتی تھی اور نہ اس قدر جلد وہ موت کا شکار ہوتا تھا۔

قدیم انسان کے جو جمجمے یا کاسہائے سر دریافت ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ قدیم کا انسان عضلات کی بیماری میں بہت مبتلا رہتا تھا، اسی طرح قدیم انسانی ڈھانچوں کے دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ مسلول انسان کی ہڈیاں ہیں۔ ابتداء عہد تاریخ کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ قدیم مصریوں میں ہڈیوں اور جوڑ کی بیماری بہت کثرت سے پائی جاتی تھی اور اسی لئے ان کی پیٹھ جھک جاتی تھی۔ اسوقت آپ کو اتنے کُبڑے انسان نظر نہیں آتے جتنے عہد قدیم میں پائے جاتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ شرائین میں سختی پیدا ہونا بھی تمدن جدید کی بیماری ہے، حالانکہ قدیم مومیاؤں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرض مصر قدیم میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ طوسیٰ کے زمانہ کا فرعون اسی میں مبتلا تھا گو انتقال اس کا ہوا اندھی آنت کی بیماری میں۔

قدیم انسان تاریک اور سرد و مرطوب غاروں میں رہتا تھا اور چونکہ بہ نسبت درندوں کے وہ عناصر سے زیادہ ڈرتا تھا۔ اس لئے وہ بہت کم باہر نکلتا تھا اور جب فراہمی غذا کے لئے مجبور ہو کر باہر آتا تھا تو جلد سے جلد پھر اندر چھپ جانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ قدیم انسان کھلی ہوا اور دھوپ میں رہتا تھا اور اس لئے بہت تندرست تھا۔ اس کے بچے تاریک غاروں میں رہنے اور اچھی غذا نہ ملنے کی وجہ سے اکثر و بیشتر سوکھے کے مرض میں مبتلا ہو کر مر جایا کرتے تھے۔

جو ڈھانچے اسوقت تک دریافت ہوئے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف قدیم کی عمر ۴۰ سال سے زیادہ ہوتی ہی نہ تھی۔ روڈیشیا (افریقہ) میں ایک جمجمہ ایسا دریافت ہوا جو جاوا وغیرہ کے دریافت شدہ جمجموں سے مختلف ہے۔ اور اختلاف یہ ہے کہ اس میں ایک سوراخ پایا جاتا ہے جو اور جمجموں میں نہیں ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ سوراخ جراثیم کا پیدا کیا ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جس انسان کا یہ جمجمہ ہے وہ پہلے کان کے امراض میں مبتلا ہوا، اور جب جراثیم اس کی سماعت کو تباہ کر چکے تو کاسۂ سر کی طرف بڑھے اور دماغ تک پہونچکر اس کی ہلاکت کا باعث ہوئے۔

قدیم انسانی ڈھانچوں اور جمجموں کی تحقیق اب ایک مستقل فن ہے اور اس کی مدد سے بہت عجیب و غریب باتیں انسان قدیم کے متعلق معلوم ہوئی ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں یہ امر بھی تحقیق ہوا ہے کہ پُرانے زمانہ میں نقرس و وجع مفاصل کے امراض بہت زیادہ پائے جاتے تھے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ دانتوں کے امراض (مثلاً پایوریا وغیرہ) جدید تہذیب کے برکات میں سے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ چونکہ پہلے انسان ہر چیز کچی کھاتا تھا اس لئے اس کے دانت مضبوط رہتے تھے اور اب ہر چیز پکا کر کھانے کی وجہ سے وہ دانتوں کی بیماریوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ خیال بھی بالکل غلط ہے۔ کیونکہ

مصر کی قدیم مومیائی شدہ لاشوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد فراعنہ سے پہلے بھی دانتوں کے امراض ان میں بکثرت پائے جاتے تھے۔

امریکہ کے ہنود احمر کے جو ڈھانچے اور جمجمے دریافت ہوئے ہیں اُن سے بھی دانتوں کے امراض کا پتہ چلتا ہے۔ جزیرۂ ہوائی کے قدیم انسان کے ڈھانچوں سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے بلکہ ان کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دانتوں کے کیڑے بعض دفعہ سر تک پہونچکر دماغ کو کھوکھلا کر دیتے تھے۔

نہ صرف انسان بلکہ عہد قدیم کے جانوروں کے جو ڈھانچے دریافت ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت کے جانور بھی اس موذی مرض میں مبتلا ہوتے تھے، چنانچہ ڈینوسور ماسٹوڈون ایسو ہیوسس قدیم جانوروں کے ڈھانچوں میں اس مرض کے علامات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ پھر جبکہ عہد قدیم کے جانور بھی امراض سے نہ بچ سکتے تھے تو انسان جو اُن سے بہت ضعیف تھا کیونکر محفوظ رہا ہوگا۔

الغرض یہ سمجھنا کہ قدیم انسان زیادہ صحیح و توانا تھا اور بڑی عمریں پاتا تھا بالکل غلط ہے وہ اکثر بیمار رہتا تھا اور مختلف بیماریاں اس کو لاحق ہوتی تھیں یہاں تک کہ مشکل سے ہزار میں سو بچے اس کے زندہ رہتے تھے اور تیس سال سے زیادہ وہ خود بھی زندہ نہ رہتا تھا۔

اس وقت چونکہ تحقیق و تفتیش سے مختلف امراض کی تعیین ہو چکی ہے۔ اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگلے لوگ ان امراض کا شکار نہ ہوتے تھے۔ وہ اب سے زیادہ سل و دق میں مبتلا ہوتے تھے، اسوقت سے کہیں زیادہ نمونیا، چیچک، تپ محرقہ، تپ میعادی، سرطان، وجع مفاصل، پایوریا وغیرہ ان کو ستاتے تھے، لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے نہ وہ ان بیماریوں میں کوئی امتیاز کر سکتے تھے اور نہ ان کا علاج۔ اب چونکہ ان تمام آلام و شکایات کی علیحدہ علیحدہ تعیین ہوگئی ہے اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ امراض بھی نئے ہیں۔

مکتوباتِ نیاز

ادب و انشاء کی دنیا میں وہ چیز جس کی مثال آپ کو اُردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و محاکات، شوخی و رنگینی سلاست و بیساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو صرف "مکتوبات نیاز" میں نظر آئیں گی۔ اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات، کاغذ دبیز، قیمت معہ محصول ؏۱۲؍ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے۔

منیجر نگار۔ لکھنو

مطبوعات موصولہ

اُردو پوئٹری مختصر سا انگریزی مقالہ ہے جناب فضل الدین اثر بی - اے کا - جس میں انھوں نے موجودہ دورِ شاعری پر بحث کرتے ہوئے سیماب، جوشؔ اور اقبالؔ پر بھی رائے زنی کی ہے - حضرت سیماب چونکہ اثر صاحب کے اُستاد ہیں اس لئے ان کی تعریف کرنی ہی چاہئے تھی - اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے انتہائی جوشِ عقیدت سے کام لیکر پوراحق شاگردی ادا کیا ہے - سیماب نہایت اچھے شاعر ہیں اور ہیں ان کے رنگِ تغزل کا بہت معترف ہوں، لیکن افسوس ہے کہ ان کے منظومات میں نہ واقعیت ہے نہ اثر - ہیں انکا شاگرد نہیں ہوں اس لئے ایسا کہہ رہا ہوں، ممکن ہے ان کا تلمذ حاصل کرنیکے بعد میں ایسا نہ کہہ سکتا یا کہنا مناسب نہ سمجھتا - بہر حال اثر صاحب کی رائے حضرت سیماب کے متعلق تو قابل لحاظ نہیں، البتہ جوشؔ اور اقبالؔ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں انھوں نے ضرور کہیں کہیں اپنی نکتہ رسی کا ثبوت دیا ہے - اقبالؔ کی بالِ جبریل کو وہ کمتر درجہ کی تصنیف خیال کرتے ہیں، حالانکہ میرے نزدیک اقبالؔ کا یہی کارنامہ یادرہجانے والا ہے - جوشؔ کی انھوں نے جتنی اور جیسی تعریف کی ہے وہ یقیناً اسی کے مستحق تھے -

یہ مقالہ مجلد شائع ہوا ہے اور دس آنہ میں آگرہ پرنٹنگ ورکس آگرہ سے ملسکتا ہے -

جہانِ آرزو جناب آرزوؔ لکھنوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے - اس سے چند سال قبل فغانِ آرزو کے نام سے ایک مجموعہ اور بھی شائع ہوا تھا اور اہل نظر نے اس کی کافی قدر کی تھی - جناب آرزو لکھنؤ کے مشہور کہنہ مشق شعرا میں سے ہیں اور گزشتہ چند سال سے بہت سہل وسادہ الفاظ میں شعر کہنے کا ڈھنگ نکالکر انھوں نے ایک خاص امتیاز اپنے لئے علٰحدہ پیدا کر لیا ہے -

آرزو کے کلام میں سادگی وسلاست کے ساتھ اثر بھی ہے اور اگر کسی جگہ انھوں نے صرف الفاظ کی شاعری کی ہے تو اس کو بھی اپنے اندازِ بیان سے بہت گوارا صورت دیدی ہے آرزوؔ کے کلام میں یقیناً نہ جوش ومستی ہے نہ شوخی ورعنائی، لیکن اس کی جستجو بیکار ہے کیونکہ وہ اس رنگ کے شاعر ہی نہیں اور ابتدا ہی سے انکی شاعری بہت "مسکنت وغربت" لئے ہوئے ہے - بعض اشعار جو سرسری نگاہ میں مجھے پسند آئے ذیل میں درج ہیں :-

غنچے چپ ہیں، گل ہیں ہوا پر کس سے کہئے جی کا حال　　خاک نشیں اک سبزہ ہے سو اپنا بھی بیگانہ بھی

غفلت سے کہیں بہتر تھی جفا یعنی کہ محبت تھی زندہ — جو ایذا تھی سب لینے کی اکبار نہیں سو بار سہی

کئے کی شرم اُدھر آرزو، اِدھر یہ خیال — دیا تھا درد جنھوں نے وہی دوا کرتے

پرسش اُدھر مزاج کی، بند اس طرف زباں — وہ وقت ہے کہ وہ بھی کہیں بیوفا مجھے،

یہ دیوان ایک روپیہ میں حقیقت بک ایجنسی لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

انتخاب کلام مطیر مطیر مرحوم، جن کا پورا نام بہ شمول استاد ڈاکٹر محمد عبدالغفور" تھا، احسان شاہجہانپوری کے شاگرد تھے۔ رہنے والے کہاں کے تھے یہ نہ مجھے معلوم ہے اور نہ دیباچہ سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ پنشن لینے کے بعد ۷۳ سال کی عمر میں آپ کا انتقال جھانسی میں ہوا اس لئے ممکن ہے وہی وطن بھی ہو۔ بہرحال وہ متوطن کہیں کے ہوں، ان کی شاعری لکھنؤ کی تھی۔

اس مجموعہ میں غزلیات، مخمسات و قطعات کے علاوہ بعض مضامین نثر کے بھی ہیں۔

یہ مجموعہ ان کے صاحبزادے محمد احسن الغفور بی۔ اے نے شائع کیا ہے اور ابتدا میں اپنے والد محترم کے مختصر حالات بھی درج کر دئیے ہیں۔ طباعت و کتابت اچھی ہے اور ۲ کے ٹکٹ بھیجنے سے ہر شخص کو مفت مل سکتا ہے۔

عورت دہلی سے ایک مشہور طبی ماہنامہ ہمدرد صحت کے نام سے جاری ہے۔ جولائی کا رسالہ جسے اشتہارات وغیرہ نکال کر ۲۴۴ صفحات کی ضخیم کتاب کہنا چاہئے، عورت کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ امراض نسائی کے متعلق کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا اس میں ذکر نہ ہو اور کوئی طریق علاج ایسا نہیں ہے جو بتایا نہ گیا ہو۔ عورت کی زندگی کے تین زمانے ہیں، ایک دوشیزگی کا، دوسرا ازدواج کا اور تیسرا ماں بننے کا۔ اس مجموعہ میں ان تینوں زمانوں سے بحث کی گئی ہے اور اس قدر تکمیل کے ساتھ کہ میری رائے میں ہندوستان کی ہر عورت کو اس کا مطالعہ میں رکھنا فرض ہے۔

کارکنان ہمدرد صحت نے جس محنت و کاوش سے اس خاص اشاعت کو پیش کیا ہے وہ یقیناً مستحق داد و ستائش ہے۔ اس مخصوص نمبر کی قیمت بارہ آنے ہے جو حقیقتاً کچھ بھی نہیں ہے۔

انقلاب روس تصنیف ہے جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول کی جس میں نہایت بسط و وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ روس کا موجودہ نظام حکومت کیا ہے اور یہ کہ اس نظام کی تشکیل کے اسباب کیا تھے۔ فاضل مصنف نے اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصۂ اول میں روس کی گزشتہ تاریخ پر بحث کرتے ہوئے اور جمہوریت کے نشو و نما اور جنگ عظیم کے بعد جو حالات رونما ہوئے ان پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے حصہ میں نظریۂ سوشلزم پر تاریخی و علمی نقطۂ نظر سے گفتگو کرتے ہوئے ۱۹۱۷ء کے ہنگامۂ انقلاب کی داستان بیان کی ہے۔ تیسرے حصہ میں وہاں کے دستور حکومت اور آئین و قوانین کو بیان کیا ہے،

چوتھے حصہ میں صنعت و حرفت اور زراعت کا ذکر کر کے پانچویں حصہ کو تعلیم و مذہب اور طرز معاشرت کے بیان پر ختم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قابل مصنف نے اس قدر تکمیل کے ساتھ اس کتاب کو پیش کیا ہے کہ موضوع سے متعلق کوئی تشنگی مطالعہ کرنے والے کو باقی نہیں رہتی۔

زبان اور اندازِ بیان حد درجہ سلیس و سادہ ہے اور اسی کے ساتھ دلچسپ بھی۔ یہ کتاب ٹائپ کے حروف میں شائع ہوئی ہے اور عہ میں ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد سے ملسکتی ہے۔

اُردو۔ ہندی اور ہندوستانی

مقالہ ہے جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول کا جو انھوں نے ہندوستانی اکاڈیمی کی لٹریری کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اسوقت اُردو ہندی کا جھگڑا بہت اُلجھا ہوا مسئلہ ہے اور ہر وہ شخص جو اُردو ہندی لٹریچر سے دلچسپی رکھتا ہے اس پر کچھ لکھنے یا سننے کی طرف مایل نظر آتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمان اور ہندو دونوں صحیح راستہ پر نہیں ہیں اور جس مقصد کو سامنے رکھ کر وہ اصلاح زبان و رسم الخط کی کوشش کر رہے ہیں وہی سرے سے بالکل گمراہ کن ہے۔

اس دوران میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے، لیکن ان تمام مقالات میں، صرف پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ہی کا ایک مقالہ ایسا ہے جس کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے والے نے جو کچھ لکھا ہے وہ واقعی سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔

میں کول صاحب کے اس بیان سے بالکل متفق ہوں کہ اُردو ہندی کی نزاع کا بڑا سبب سیاسی نزاع ہے اور اسی کے ساتھ میں اس باب میں بھی ان کا ہم خیال ہوں کہ سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تمام ہندوستان کے باشندوں کی ایک ہی زبان ہو اور وہ ایک ہی رسم الخط کے پابند ہو جائیں۔ اگر ہندو ہندی رسم الخط کی طرف مایل ہیں تو اس کے یہ معنے نہیں کہ مسلمان اُردو رسم خط چھوڑ دیں اور اگر مسلمان ہندی رسم الخط اختیار نہیں کرتے تو ہندو اس کو سیاسی اختلاف کی صورت میں پیش کریں۔

کول صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے اور اس سے قبل بارہا میں بھی نگار کے ذریعہ سے اس خیال کا اظہار کر چکا ہوں کہ ابتدائی ثانوی مدارس میں اُردو ہندی دونوں کی تعلیم لازمی قرار دینا چاہئے۔ تاکہ ہندو مسلمان دونوں کو ایک دوسرے کے لٹریچر، تاریخی واقعات اور مذہبی روایات سے واقف ہونے کا موقعہ ملے اور یہ بیگانگی جو اس وقت زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آ رہی ہے دور ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ اس طرف کسی نے توجہ نہیں کی اور دور از کار مباحث و تدابیر میں وقت ضایع کیا گیا۔

زبان کو سادہ و سلیس بنانے کے طرفدار کول صاحب بھی ہیں، لیکن وہ عربی و فارسی الفاظ کے ترک

کر دینے کے موید نہیں ہیں کیونکہ اُردو بغیر عربی و فارسی الفاظ کی مدد کے علمی زبان کبھی نہیں بن سکتی۔ بہرحال کول صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ یقیناً ان کے غایر مطالعہ کا نتیجہ ہے اور جس نتیجہ پر وہ پہونچے ہیں اسکی صحت کا کم از کم مجھے ضرور اعتراف ہے۔

قومی زبان اس رسالہ میں مولوی یعقوب الرحمان عثمانی نے اُردو زبان کی وسعت و اہلیت پر روشنی ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی یہی ایک زبان ایسی ہے جو مشترک زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ رسالہ آٹھ آنے میں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

اطلاعنامہ بنام دائنان دربارہ ادخال درخواست بریت

دفعہ ۱۳ (۱) ایکٹ ۵ سنہ ۱۹۲۰ء

بعدالت جناب جج صاحب بہادر خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۲، ۷ سنہ ۱۹۳۵ء

بمقدمہ قرار داد دیوالیہ مسمی موتی ولد پرسا و سماۃ لچھمن زوجہ موتی اقوام مہتر ساکنان گڈھیا چار باغ لکھنؤ۔ سایلان

بنام

(۱) گیا پرشاد و (۲) متھرا پرشاد پسران لچھمن داس ساکن رستوگی ٹولہ تھانہ چوک لکھنؤ۔ (۳) گنگا دھر رستوگی ساکن راجہ بازار تھانہ چوک لکھنؤ۔ (۴) منا ولد مستری ساکن رستوگی ٹولہ لکھنؤ۔ (۵) نانک سنگھ قوم سکھ پنجابی ساکن آریہ نگر لکھنؤ۔ (۶) ملک اللہ بسابایا ساکن گھسیاری منڈی لکھنؤ۔ (۷) آغا شاہ محمد خاں کابلی ساکن امانی گنج لکھنؤ (۸) بنواری لال ساکن رستوگی ٹولہ لکھنؤ۔ (۹) موہن مہاراج ساکن جیتواپور عقب چوکی پولیس لکھنؤ۔ (۱۰) گنیشی ساکن تکیہ پیر جلیل لکھنؤ۔ (۱۱) محمد ولد نادر خاں ساکن مولوی گنج لکھنؤ۔ (۱۲) آغا حبیب اللہ ساکن ناکہ عیش باغ لکھنؤ۔ (۱۳) گوپال داس رستوگی ساکن بازار راجہ لکھنؤ۔ (۱۴) درگا ولد نامعلوم ساکن ناکہ ہنڈولہ لکھنؤ۔

مطلع ہو کہ دیوالیہ مذکور الصدر نے اپنی بریت کی درخواست عدالت ہذا میں گزرانی ہے اور عدالت ہذا نے سماعت درخواست کے واسطے تاریخ چھ اگست سنہ ۳۶ء بوقت دس بجے دن مقرر کی ہے۔

تاریخ ۲۲ ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء

دستخط منصرم بخط انگریزی

آخری وصیت

(انگریزی شاعرہ روزیٹی کی ایک نظم کا ترجمہ براہ راست انگریزی سے)

یاد کرنا بچھڑ کے جب تم سے — ہم بسائیں گے شہر خاموشاں
دور بستی سے، کالے کوسوں دور — کوئی پرساں نہیں کسی کا جہاں

یاد کرنا وہ وقت، پیارے جب — تم مرے ہاتھ کو دباتے تھے
اور حیا سے یہ حال تھا میرا — پاؤں تھراتے، لڑکھڑاتے تھے

پھیر کے منھ کو جانا چاہتی تھی — پر نہ اُٹھ سکتے تھے قدم میرے
دیکھ کے تر مجھے پسینے میں — آپ ہی تم ہاتھ چھوڑ دیتے تھے

یاد کرنا وہ وقت جب ہر روز — سوچا کرتے تھے ہم بہم کیا کیا
آہ بس یاد ہی کیا کرنا — وقت ہوگا دعا نہ مشورے کا

بھول جاؤ کبھی جو بھولے سے — اور پھر اُس کے بعد یاد کرو
رنج کرنا نہ میری جاں کی قسم — روح خوش ہوگی جس میں تم خوش ہو

کیونکہ تاریکیٔ و فنا نے اگر — شائبہ بھی خیال کا چھوڑا
یہ تصور چلائے گا چھُریاں — دشمنوں کو ہے غم جدائی کا

سُن لو یہ آخری وصیت ہے — ٹھنڈی سانسیں بہت نہ بھرنا تم
کرلو وعدہ، اگر محبت ہے — یاد کرنا مگر نہ کڑھنا تم

اثر لکھنوی

یاد ہے

گلفروشی، برقباری کا فسانہ یاد ہے
مسکرا کر وہ ترا آنچل اُٹھانا یاد ہے

یاد ہیں وہ میکدہ بردوش نظریں یاد ہیں
وہ ترا بھر بھر کے جام مے پلانا یاد ہے

ناز سے اُلجھے ہوئے گجروں کو سلجھاتے ہوئے
وہ ترا دھیمے سُروں میں گنگنانا یاد ہے

بے رُخی کے ساتھ سُننا درد دل کی داستاں
وہ کلائی میں ترا کنگن گھمانا یاد ہے

ہے دہکتی آگ کا ابتک نگاہوں میں سماں
جوش میں چہرے کا ترے تمتمانا یاد ہے

وہ مرے اشعار پر رنگیں لبوں کی واہ وا!
لُطف لے لیکر ترا چٹکی بجانا یاد ہے

وہ ترا غور و تفکر، وہ ہوائیں تیز تیز
گیسوؤں کا رُخ سے جھنجلا کر ہٹانا یاد ہے

وہ تری مستی بھری خود ساختہ سنجیدگی
اُنگلیوں سے خشک مہندی کا چھڑانا یاد ہے

وہ ترا جذبات کو آتش فشاں کرنے کا ڈھنگ
وہ ترا ہر بار مجھ سے روٹھ جانا یاد ہے

فتنہ ساماں! وہ ترا انگڑائی لینے کے لئے
آسماں کی سمت ہاتھوں کا اُٹھانا یاد ہے

وہ ترے رنگین ہونٹوں پر تبسم کی بہار
پھول بن بن کر ترا بجلی گرانا یاد ہے

وہ ترا بدمست ہوکر، کچھ نہ کہہ سکنا، مگر!
ہونٹ کو رہ رہ کے دانتوں میں دبانا یاد ہے

وہ ہتھیلی سے ترا آنکھوں کا ملنا دیکھ کر
صبح کے تاروں کا پیہم جھلملانا یاد ہے

ہائے یہ بے کیفیٔ دل، وائے یہ ویرانیاں!
وہ تو یہ کہئے کہ تیرا مسکرانا یاد ہے

حضرت ماہر تمہیں ان غم فزا حالات میں
یہ ہی کیا کم ہے محبت کا فسانہ یاد ہے

ماہر القادری

شام برشگال

یہ نکہتوں کی بستیاں، یہ بہکی بہکی مستیاں!
بہار زرنگار کی یہ طرفہ بلند ستیاں

یہ بادلوں کے قافلے رواں، دواں، یہاں وہاں
سبو چھلکتے، جہاں کہیں جگا دیں مے پرستیاں

ہر ایک چیز مست ہے نوازش بہار سے
شراب بہہ رہی ہے پھر فراز کوہسار سے،

تجلیاں تمام تر زمیں پہ بکھر گئیں
بکھر کے خود نکھر گئیں، نکھر کے خود سنور گئیں،

تمیم نعمانی نیازی

انتظار

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

خوش تھے ہم خواب میں وہ مست شباب آئیگا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا

نظریں نیچی کئے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ گھبرائے ہوئے آئے گا

پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو وہ آہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی

صبح نے سیج سے اُٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی ،

میرے محبوب میری نیند اُڑانے والے
میرے مسجود میری روح پہ چھانے والے

اب بھی آجا کہ میرے سجدوں کا ارماں نکلے
تیرے قدموں پہ مری جان مری جاں نکلے

مخدوم محی الدین بی - اے (عثمانیہ)

کیا ہو تم ؟

بہت حسین ، بڑے دوست آشنا ہو تم
حیات عشق کا معصوم مدعا ہو تم

میں جس خیال میں کھویا ہوا سا رہتا ہوں
اُسی خیال کی تشکیل جانفزا ہو تم

سحر کی ضو میں شفق کی حسین شاموں میں
مری حیات کا اک خواب خوشنما ہو تم

تمھیں ہزار حجابوں میں دیکھ لیتا ہوں
جدا نہیں ہو بہر حال ، گو جدا ہو تم

یہ برق پاش نگاہیں یہ جلوہ ریز ادا
شعاع حسن ہو یا موجۂ ضیا ہو تم

نگاہیں نیچی کئے ، شرم سے لجائے ہوئے
کوئی مجسمۂ عفت و حیا ہو تم

خرام نغمہ ہو یا نغمہ خراماں ہو
سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی صدا ہو تم

حسین خواب ہو میری جوان راتوں کا
کہ خواب عشق کی تعبیر جانفزا ہو تم

خود اپنی مست اداؤں میں آپ کھوئے ہوئے
مجھے خبر ہی نہیں ہے ابھی کہ کیا ہو تم

یہ انکشاف ہیں سب ممکنات کی حد تک
دگرنہ سچ تو ہے یہ ان سے ماورا ہو تم

انور (از نیا در)

غزل

بے وفا دنیا کے دم میں بدنصیب آہی گیا
دل ہی تھا آخر ، فریب دوستی کھا ہی گیا

اب کہاں پہلو میں دل کی بیقراری کے مزے
اب وہ شغل نالۂ شام و سحر گاہی گیا

ترکِ اُلفت خوب ہے لیکن اسے کیا کیجئے !
جب خیال آیا کسی کا دل کو تڑپا ہی گیا

دوستداری اور وفا کیشی کی امید آپ سے !
آپ نے فرمایا ، مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

انجم رضوانی

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت علاوہ محصول عار

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے

قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیریں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل کے متعلق عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ کی صحیح پیشینگوئی کر سکتا ہے

قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام تر نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں

قیمت علاوہ محصول ۱۲

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں
۱۔ چند مشہور فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔
۲۔ مادیین کا مذہب
۳۔ حرکت سے کرہ تک
نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت (۱۲) علاوہ محصول

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے

قیمت (عہ) علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ تمدنی ترقی دنیا میں سب سے پہلے کہاں ہوئی زبردست کتاب لکھی گئی ہے اس کی مستند ترین تصنیف اردو میں اس موضوع پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اس کی عظمت کو اعلیٰ حضرت ریاست بھوپال نے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

صحابیات

اسمیں عہد سعادت کی ۸۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دئے گئے ہیں اسکا مقدمہ جسے مولف نے خاص اہتمام سے لکھا ہے دیکھنے کے قابل ہے اس موضوع پر اور کتابیں بھی گو مصنفین کی وجہ سے موجود ہیں لیکن انکی صحابیات کے حالات کسی کتاب میں درج نہیں کئے گئے ہیں۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

المسئلۃ الشرقیہ

مصطفےٰ کمال پاشا کی اس مشہور عالم کتاب کا ترجمہ ہے جسنے یورپ و ایشیا کی سیاسیات میں ہلچل ڈالدی تھی اور جسنے سب سے پہلے ترکی و مصر و عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونک کر عالم اسلامی کے درخشاں مستقبل کو بے نقاب کر دیا تھا۔ قیمت عاہ علاوہ محصول۔

عرض نغمہ

یعنی ٹیگور کی گیتان جلی کا سب سے پہلا اردو ترجمہ جسکے متعلق ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری مرحوم کی رائے تھی کہ دنیا کی کسی زبان میں گیتان جلی کا ترجمہ اس سے بہتر نہیں کیا گیا اسکے شروع میں ایک نہایت ہی دلچسپ مقدمہ بھی شامل ہے قیمت غیر مجلد عہ علاوہ محصول

نرخنامۂ اُجرت اشتہار

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھا صفحہ	۵۰ ″	۲۵ ″	۱۳ ″	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۲۵ ″	۱۳ ″	۷ ″	۴ روپیہ

۱- اُجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی - وی پی یا دی پی کے ذریعہ وصولی منظور نہیں

۲- جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اُس کی رقم پیشگی یکمشت لی جائے گی۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا۔

۳- اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

منیجر "نگار" لکھنؤ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر...... پانچ روپیہ

ششماہی ہندوستان کے اندر..... تین روپیہ

سالانہ بیرون ہند....... بارہ شلنگ

ششماہی بیرون ہند....... ۷ شلنگ

نوٹ:- رسالہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ بعد کو آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔ حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔

"منیجر"

تصانیف نیاز فتحپوری

مجموعۂ استفسار و جواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۲۹ء تک کے استفسار و جواب شائع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں۔

قیمت:- جلد اول [illegible]
جلد دوم [illegible]
علاوہ محصول۔

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔

جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے
علاوہ محصول۔

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲ - افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں زبان، قدرت بیان، علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی آپکو اس مجموعہ میں نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول۔

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسانی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے)
علاوہ محصول۔